اقبال
کا
نظریہ
عقل و عشق

EB-00021974

☆☆●☆☆

انور شیخ

U
851.09
A61I

Courtesy: Mazhar Imam
Mazhar Imam Collection
U
851.09
A61I

انور شیخ

اقبال

کا نظریہ عقل و عشق

علامہ اقبال نے اپنی شخصیت کا خاکہ اس چابکدستی سے کھینچا ہے کہ اس پر مزید خامہ فرسائی کی ضرورت نہیں۔ فرماتے ہیں:

حضور حق میں اسرافیل نے میری شکایت کی — یہ بندہ وقت سے پہلے قیامت کر نہ دے برپا

شعریات اقبال نے آخر یہ معجزا کر ہی دکھایا۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے ہندوستان کے اس تاریخی دور کا تصور کیجئے جس کا تعلق اگست 1947ء سے ہے۔ میں نے ریلوے سٹیشن۔ لاہور پر قیامت کا نمونہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ امرتسر سے آنے والی گاڑی ایک ہزار سے بھی کہیں زائد مسلمانوں کے خون سے لت پت تھی۔ اس میں بچے۔ بوڑھے۔ خواتین سبھی شامل تھے۔ کسی کا سر غائب تھا تو کسی کا دھڑ۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ قاتلوں نے مقتولین کے خون سے جی بھر کر ہولی کھیلی ہو اور ان کی چیخ و پکار سے وہی لطف حاصل کیا ہو جو تماش بین کسی کوٹھے والی کے گیت اور مجرے میں پاتے ہیں۔ اس منظر میں اس قدر دہشت تھی کہ اسے دیکھ کر روز محشر کی روح فرسا حقیقت سے انکار کرنا ممکن نہیں۔

یہ قیامت جو تقسیم ہند کے روپ میں رونما ہوئی یہ بڑی حد تک اقبال کی شاعری کا ہی ایک کرشمہ تھا۔ اگر ہزار چوہدری رحمت علی بھی کوشش کرتے تو وہ تصور پاکستان کو حقیقت میں نہیں بدل سکتے تھے کیونکہ اس کے لئے ایک ایسا اجتماعی رجحان پیدا کرنے کی ضرورت تھی جس کی بنا عقل کے بجائے جذبات پر ہو۔ مسلمانان ہند کو مذہبی جنون میں مبتلا کر کے وطن کشی پر تیار کرنا ایک ایسا "کارنامہ" تھا جس کا سہرا اقبال کے سر ہے۔

اقبال نے یہ طرۂ امتیاز کس طرح حاصل کیا؟ اس کا ذریعہ ان کی غیر فطری شاعری ہے جس کی اساس عقل کی تضحیک اور

عشق کی ترغیب پر ہے۔ انہوں نے عقیدے کو دانش پر ترجیح دینا اپنا مسلک بنالیا اور اپنی شاعری سے مسلمانان ہند کو یہ یقین دلایا کہ "ہندوستانی قومیت سراسر ایک لغویت ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے وطن سب سے بڑا بت ہے جسے توڑنا ہی سچی مسلمانی ہے اس لئے قومی اعتبار سے وہ صرف مسلمان ہیں"۔ لوگ علامہ موصوف کی باتوں میں آگئے اور انہیں یہ یاد نہ رہا کہ دنیا بھر کے مسلمان اپنی۔ اپنی علاقائی شناخت کے سبب عربی۔ مصری۔ ایرانی۔ افغانی اور ترک ہیں تو پھر ہندوستانی مسلمانوں کی ہندی قومیت میں کیا قباحت ہے؟ محض ہندوؤں کے تعصبات کی وجہ سے اپنے ہی وطن کو دارالحرب گردانتے ہوئے اسے گہوارۂ شر قرار دینا اور تقسیم وطن کو اپنی مشکلات کا حل سمجھنا انتہائی نادانی اور بزدلی تھی۔ یہ فطرت کے خلاف اعلان جنگ تھا کیونکہ ہر انسان پیدائشی طور پر تمدنی۔ لسانی اور نسلی اعتبار سے کسی نہ کسی گروہ سے تعلق رکھتا ہے۔ یہی اس کا قومی تشخص ہے جس کے بغیر انسانی تہذیب پروان نہیں چڑھ سکتی۔ یہ ایک ایسی صداقت ہے جس کا ذکر کرتے ہوئے قرآن میں کہا گیا ہے کہ خالق نے بنی نوع انسان کو اس لئے شعوب و قبائل میں تقسیم کیا ہے کہ وہ پہچانے جائیں (الحجرات 49 : 13)۔ یہ قومی پہچان جو انسانوں کی عزت اور ذلت کا سبب بنتی ہے تاریخ اقوام اور تمدن کی روح ہے۔

مسلمانان ہند نے اقبال کی شاعرانہ جادوگری کی تاب نہ لاتے ہوئے اپنی ہندوستانی قومیت سے انکار کر دیا جو کہ عقلیت کے خلاف جنگ اور طوفان بد تمیزی تھا لیکن بعض لوگ اسے ادائے عشق کہنا بہتر سمجھتے ہیں۔ جب قدرت نے عوام کو گروہوں۔ قبیلوں اور قوموں میں بانٹ دیا ہے تو اس اصول کی خلاف ورزی ایک فطری عمل کیسے ہو سکتا ہے؟ ایک طرف یہ دعوی کہ اسلام وطنیت کا دشمن ہے اور دوسری طرف یہ مطالبہ کہ مسلمانان ہند کو ایک **الگ وطن** (پاکستان) کی اشد ضرورت ہے ایک انتہائی احمقانہ اقدام ہے۔ ایک غیر فطری تقاضا ہونے کے سبب یہ دیرپا بھی ثابت نہیں ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان ایک قلیل عرصے میں دو اوطان یعنی پاکستان اور بنگلہ دیش میں بٹ گیا اور اس طرح ہندوستانی مسلمان جو خود کو ایک قوم سمجھتے تھے تین حریف قومیتوں میں منقسم ہو گئے۔ نتیجتہً وہ سب کے سب پسماندگی۔ کسمپرسی۔ غربت۔ ناانصافی اور ظلم و ستم کا شکار بن چکے ہیں اور ان کی زبوں حالی کا عالم اس قدر دردناک ہے کہ یہ قیامت سے کم نہیں اس لئے اسے "اعجاز اقبال" سے منسوب نہ کرنا غیر مناسب ہوگا۔

یہ انسانی تمدن کا ایک اٹل اصول ہے کہ جو جس وطن میں پیدا ہو وہی اس کی وطنیت یعنی قومیت ہوتی ہے اور اس میں مذہب اور ذاتی عقائد کو کوئی دخل حاصل نہیں۔ اس کے باوجود ہندی مسلمانوں نے اس حقیقت کو ٹھکرا دیا جو ان کی عقل دشمنی اور جذبات پرستی کا ثبوت ہے۔ اس تبدیلی کا آلہ کار اقبال کا نظریہ عقل و عشق ہے۔

اس نکتہ کو سمجھنے کے لئے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ مذہب میں عقیدت مندی کے باعث آزادی افکار کے لئے کوئی گنجائش نہیں جو کہ فلسفہ دانی کی بنیاد ہے۔ علامہ اقبال نے اسی لئے کہا تھا

گو فکر خداداد سے روشن ہے زمانہ　　آزادی افکار ہے ابلیس کی ایجاد

"فکر خداداد" عقل کا دوسرا نام ہے۔ اگر عقل کو اوہام و رسوم کی زنجیر پہنا دی جائے تو وہ اس پرندے کی مانند ہے جس کے پر کاٹ دیئے گئے ہوں۔ جو اڑ نہ سکے اسے پنچھی کیسے کہہ سکتے ہیں؟ جب عقل مصنوعی بندشوں سے آزاد ہو تو وہ آزادی

افکار کی ماں بن جاتی ہے لیکن اقبال اسے "ابلیس کی ایجاد" سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کو فلسفی کہنا۔ نوعیت فلسفہ سے قطعی جہالت کا اعتراف ہے۔ جو شخص حریت فکر کے زیور سے آراستہ نہ ہو وہ کبھی فلسفی ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فلسفیانہ سوچ کی بنیاد۔ عقل اور مشاہدہ پر ہوتی ہے اور جو بات دانش کے خلاف ہو وہ اسے تسلیم نہیں کرتا۔ وہ دو اور دو ہمیشہ ہی چار گنتا ہے۔ محض عقیدت کی وجہ سے اسے سوا چار یا پونے چار شمار نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ تمام دنیائے اسلام نے ایک بھی فلسفی پیدا نہیں کیا حتیٰ کہ ابن رشد اور بو علی سینا بھی اس مقام تک نہیں پہنچتے۔ فلسفی کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک منفرد نظام فکر کا موجد ہو اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک وہ فکری قیود سے پوری طرح آزاد نہ ہو۔ جنہیں اہل اسلام "مسلمان فلاسفر" کہتے ہیں وہ دراصل متکلمین تھے۔

مسلمان ہونے کے ناطے سے ان کی فکر اسلامی حدود کی پابند تھی اور وہ ان سے باہر نہیں جا سکتے تھے۔ جسے اسلام نے جائز قرار دیا وہ اسے ناجائز کہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ان میں یہ سوچنے کی جرات ہی نہیں تھی کہ:

الف۔ اگر خدا بے نیاز ہے تو پھر اس نے انسان کو عبادت کے لئے کیوں پیدا کیا؟ اس کی اسے یقیناً حاجت ہوگی۔

ب۔ اسے سجدوں کا اتنا جنون کیوں ہے کہ جو اس کو سجدے نہ کرے وہ اسے جہنم میں دھکیل دے گا جو سانپوں اور بچھوؤں کی آماجگاہ ہے لیکن اس کے باوجود وہ خود کو غفور اور رحیم کہتا ہے۔

ج۔ غیر مسلمانوں کو مذہبی اختلاف کی بنا پر قتل کرنا اور ان کی بیٹیوں کی عصمت ریزی کو کار خیر قرار دینا۔ کہاں کی پرہیزگاری ہے۔ یہ تو حد درجے کی سفاکی اور بد دیانتی ہے۔

د۔ اگر خدا واقعی خالق ہے تو اس نے ہر ایک کو مسلمان بنا کر پیدا کیوں نہیں کیا تاکہ مذہبی اختلاف کی بنا پر جہاد کی آڑ میں غیر مسلمانوں پر ظلم و ستم کی ضرورت ہی نہ پڑے۔

ر۔ مردوں کو جنت کا لالچ دے کر گناہ پر اکسانا کیسی طہارت ہے؟

ڑ۔ آخر کیا وجہ ہے کہ تمام مقدس ترین مقامات عرب ہی میں ہیں جس سے صرف عربوں ہی کو فائدہ ہوتا ہے۔ باقی ممالک سے اللہ کو صرف لفظی ہمدردی کیوں ہے؟

ایسے ہی درجنوں سوالات اور بھی ہیں جن پر صرف ایک فلسفی ہی غیر جانبداری سے غور کر سکتا ہے یہ کسی مسلمان مفکر کے بس کا روگ نہیں۔ اقبال نے اسی لئے کہا تھا

نہ فلسفی سے نہ ملا سے ہے غرض مجھ کو — یہ دل کی موت، وہ اندیشہ و نظر کا فساد

یہاں بقول اقبال فلسفی وہ ہے جس کے دل کی موت واقعہ ہو چکی ہو یعنی اس میں عقیدہ ہو ایمان کا مکمل فقدان ہو۔ یہ نتیجہ ہے آزادی فکر کا۔ چنانچہ فرماتے ہیں

آزادی افکار ہے ان کی تباہی — رکھتے نہیں جو فکر و تدبر کا سلیقہ

ہو فکر اگر خام تو آزادی افکار — انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

یہ کوتاہ نظری اور شاعرانہ زبان درازی کی انتہا ہے۔ شہباز اسی لئے شہباز ہے کہ اسے اپنی پوری قوت پرواز آزمانے کا حق حاصل ہے۔ یہی آزادی پرواز اس کی شہبازی کی ضامن ہے۔ اسی طرح عقل بھی اسی وقت تک عقل کہلانے کی مستحق ہے جب کہ فکر و تدبر اس کی اپنی قدرت کے تحت ہوں۔ اگر اسے عقیدت کی بیڑیوں میں جکڑ دیا جائے تو وہ مشعل راہ نہیں رہتی بلکہ اندھے کی مانند بن جاتی ہے جسے اپنی راہ ٹٹولنے کے لئے لاٹھی کی ضرورت پڑتی ہے۔

ایک مسلمان کے لئے پہلے ہی نظریات اور احکامات تجویز کر دیئے گئے ہیں۔ اسے ان سے انحراف کرنے کی قطعی اجازت نہیں۔ ایک عقیدت مند کا فرض ہے کہ اگر اسے کہا جائے کہ برف گرم اور آگ ٹھنڈی ہوتی ہے تو وہ اسے تسلیم کرے کیونکہ ایمان اسی کو کہتے ہیں۔ جو ایسا نہ کرے وہ کافر کہلاتا ہے۔ ایک سچے مومن کی نشانی یہ ہے کہ دنیا کی ان تمام باتوں کو جادوئے تاویل سے توڑ موڑ کر اس طرح بیان کرے کہ وہ سب اس کے اعتقادات کے تابع نظر آنے لگیں۔ ایسے شخص ہی کو متکلم کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام "اسلامی فلاسفہ" متکلمین کہلانے کے مستحق ہیں۔ انہیں فلسفی کہنا اس اصطلاح سے نادانی کی دلیل ہے۔

کہتے ہیں کہ عقل نور ہے لیکن یہ مقولہ اسی وقت تک صادق ہے جب تک عقل کو کجروی کا حجاب نہ پہنایا جائے۔ اگر اسے ذریعہ صداقت بنانے کے بجائے تاویل بازی کا آلہ قرار دے دیں تو یہ ایک ایسی سیاہی کا روپ دھار لیتی ہے جو روشنی کو اس طرح تاریکی میں بدل دیتی ہے جیسے گرہن۔ ضیائے مہر کیلئے ردائے ظلمت ثابت ہوتا ہے۔ جو شخص متکلم ہو اسے اپنے اعتقادات کا جنون ہوتا ہے جو اکثر فرضی۔ لغو اور ماؤف الدماغی کا نتیجہ ہونے کے علاوہ اسے اسی طرح نفسیاتی سہارا دیتے ہیں جیسے لاٹھی بڑھاپے یا اندھے پن کے لئے ہوتی ہے۔ لہٰذا ایک متکلم دراصل دشمن عقل ہوتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس میں عقل کی کمی ہوتی ہے۔ عین ممکن ہے کہ وہ اعلےٰ فراست کا مالک ہو لیکن وہ اسے عیارانہ طور پر اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے استعمال کرتا ہے اور اس طرح باطل کو عقلی دلائل سے سچ ثابت کرنے پر مصر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے ایک متبادل نقطہ نظر کی ضرورت پڑتی ہے جسے وہ بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے تاکہ اس کا سر اونچا رہے۔ دنیائے اسلام میں اس کی کئی مثالیں ملتی ہیں جیسے تصوف کو شریعت کے خلاف کھڑا کر دیا گیا ہے حالانکہ قرآن کی رو سے تصوف بدعت کا بدترین نمونہ ہے۔ اسی طرح صوفیا نے عقل کو شیطان اور عشق کو یزدان کا درجہ دے رکھا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اقبال کو متکلمین کے زمرے میں شامل کرنا بھی مشکل ہے چہ جائیکہ انہیں فلسفی کہا جائے۔ ان کی عقل دشمنی کا جنون انہیں اس سعادت سے محروم کرتا ہے۔

چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں — مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعل راہ — کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحب ادراک

عقل عیار ہے سو بھیس بدل لیتی ہے — عشق بیچارہ نہ ملا ہے۔ نہ زاہد۔ نہ کلیم

تازہ ہے ضمیر میں معرکہ کہن ہوا — عشق تمام مصطفیٰ! عقل تمام بولہب

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی
عشق فرمودہ قاصد سے سبک گام عمل
عقل سمجھی ہی نہیں معنی پیغام ابھی

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم
عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوز دمبدم
آدمی کے ریشے ۔ ریشے میں سما جاتا ہے عشق
شاخ گل میں جس طرح باد سحر گاہی کا نم

ترے سینے میں دم ہے دل نہیں ہے
ترا دم گرمیٔ محفل نہیں ہے
گذر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے

خرد سے راہرو روشن بصر ہے
خرد کیا ہے ؟ چراغ رہگزر ہے
درون خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا
چراغ رہگزر کو کیا خبر ہے !

الٰہی عقل خجستہ پے کو ذرا سی دیوانگی سکھا دے
اسے ہے سودائے بخیہ کاری ۔ مجھے سر پیرہن نہیں ہے

علم میں بھی سرور ہے لیکن
یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں
خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ بھی نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ بھی نہیں

خرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ
سکھائی عشق نے مجھ کو حدیث رندانہ
مقام عقل سے آساں گذر گیا اقبال
مقام شوق میں کھویا گیا وہ فرزانہ

ان چند مندرجہ بالا اشعار سے عقل کی تحقیر اور عشق کی تکبیر کا ثبوت ملتا ہے اور یہی اقبال کے متکلم ہونے کی علامت ہے۔ عقل کیا ہے ؟ اور عشق کیا ہے ؟ یہ بہت اہم سوالات ہیں۔ فلاسفہ نے ان کے جوابات دینے میں بڑی عرق ریزی سے کام لیا ہے۔ میں بھی ان پر اپنا اظہار خیال ضرور کروں گا لیکن صرف ایسا کرنے سے زیر بحث مسئلہ کی نوعیت اجاگر نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے علم کلام کے پس منظر سے آشنائی مفید ثابت ہوگی:

سلطنت روم جو بعد میں بازنطینی نام سے مشہور ہوئی اس کے لئے سیاسی طور پر عیسائیت کو اپنانا لازم ہو گیا تا کہ لوگوں کو مذہبی جال میں پھنسا کر شدت عقیدت سے ان پر اپنا وقار قائم رکھ سکے۔ اس سے پیشتر رومن سلطنت PAGANISM کی مربی تھی۔ اسے غلطی سے اصنام پرستی بھی کہا جاتا ہے لیکن یہ سریانی فلسفہ پر مبنی ہونے کے

باعث منطقی اصولوں کی پابند تھی۔ فطرت پرستی۔ نظریہ وحدت الوجود اور تصور فنافی اللہ سب اس کی کڑیاں ہیں۔ میں نے اپنی انگریزی تصنیف THE VEDIC CIVILISATION میں اس حقیقت پر مفصل بحث کی ہے کہ ان عقلی اصولوں کی جنم بھومی ہندوستان ہے۔ یونان نہیں۔ ہندوستان اس اعزاز عقلیت سے محض تاریخی حوادث کے سبب محروم ہوگیا۔

تکمیل مقصد کیلئے کوئی راہ بھی اختیار کرنا اصول سیاست کا جزو ہے چونکہ رومن سلطنت کی بنیادوں کو استوار کرنے کیلئے عیسائیت کی ضرورت تھی جو کہ سراسر عقیدت یعنی غیر عقلی اصولوں پر مبنی ہے۔ شہنشاہ جسٹینین (JUSTINIAN) نے اس مذہب کو سرکاری عقیدہ قرار دینے کے لئے 529ء میں سرکاری اعلان کر دیا لیکن اس کو ایک عظیم مسئلہ درپیش تھا اور وہ یہ کہ پچھلی نو صدیوں سے یونان (ایتھنز) کی افلاطونی اکیڈمی عقل و حکمت کا درس دے رہی تھی جس کے باعث عوام منطقی باتوں پر یقین کرنے لگے تھے۔ عیسائی عقیدت مندانہ اوہام کی طرف کون دھیان دے گا؟

"نہ رہے گا بانس۔ نہ بجے گی بنسری" کے مسلمہ اصول پر عمل کرتے ہوئے جسٹینین نے افلاطونی درس گاہ کو ہی بند کر دیا۔ عقل کو مذہب کا پابند بنانے کیلئے یہ ایک انوکھا متکلمانہ اقدام تھا لیکن ان مذہبی تقاضوں کی فوری تکمیل ممکن نہ تھی کیونکہ نئے تصورات کو پرانے نظریات پر غلبہ پانے کیلئے کچھ وقت درکار ہوتا ہے۔ چنانچہ عقل اور مذہب میں مطابقت پیدا کرنے کے لئے زمانہ وسطیٰ کے دوران ایک عیسائی ادارے نے جنم لیا جو SCHOLASTICISM یعنی "عیسائی درسیت" کے نام سے موسوم ہوا۔ اس کا کام مسیحی اصولوں کو منطقی رنگ میں پیش کرنا تھا۔ یہ ایک کٹھن مرحلہ تھا جسے عقلی دلائل سے سر کرنا غیر ممکن تھا لیکن دور از کار تاویلوں سے ایسی فضا پیدا کر دی گئی کہ دانش۔ مذہبی عقیدت مندی کا دوسرا نام بن کر رہ گئی۔

اگرچہ اس تحرک کیساتھ عظیم عیسائی علما کے نام جڑے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں بوایتھی یس (BOETHIUS) کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اگرچہ عقل کو مذہب کے تابع کرنا اس شخص کا پیشہ تھا۔ اس حقیقت کا کبھی اقرار نہ کرنا اس کی خاصیت تھی تاکہ مذہب کی بالادستی عقل کی محتاج نظر نہ آئے۔

اسی طرح ایک اور عیسائی عالم جس کا فرضی نام ڈیو۔ نی۔ سیس (DIONYSIUS) تھا۔ اس سلسلے میں مہارت نامہ رکھتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ شام (SYRIA) کا ایک فلاطنیوی (NEOPLATONIST) تھا۔ اس کی تحریروں کا اثر اس تحریک پر ایک ہزار برس تک محیط رہا۔ گیارہویں صدی کے دوران جب مسیحی علما میں ارسطو کے نظریات کا اثر فزوں تر ہوا تو اس کی گونج ہسپانیہ میں بھی سنائی دی جو اس وقت اسلام کے قبضے میں تھا۔ ابو علی ابن سینا اور ابن رشد دونوں ہی ارسطو کے مداح تھے۔ ابو علی ابن سینا نے ارسطو کو چالیس بار پڑھا لیکن جب اس طرح بھی وہ اس کے تصورات کو کماحقہ نہ سمجھ سکا تو انہیں زبانی حفظ کر لیا۔ یہ دو متکلمین (فلسفی) ارسطو کے خیالات کو انسانی علوم کی تکمیل سمجھتے تھے۔ اور ان کی کاوشوں کا نہ صرف مغربی دنیا پر اثر پڑا بلکہ ان سے عالم اسلام میں بھی عقلیت کی ساکھ پختہ ہوئی لیکن مسلمانوں میں عقلی نقطہ نظر کا آغاز ابن سینا اور ابن رشد سے نہیں۔ تحریک معتزلہ سے ہوا جس کی بنیاد 757ء کے دوران بغداد میں پڑی۔ اس کی وجہ بھی یونانی فلسفہ

ہی تھا جس نے مسلم علما کی توجہ عقل و منطق کی طرف مبذول کی اور ایک عجیب سوال اٹھ کھڑا ہوا:

کیا قرآن ابد سے موجود تھا یا یہ بھی تخلیق کا درجہ رکھتا ہے؟

معتزلہ کٹر مسلمان ہونے کے باوجود عقلیت کے قائل تھے۔ نہ وہ قرآن کی ابدیت کو مانتے تھے اور نہ ہی ان اصولوں کو تسلیم کرتے تھے جو عقل کے منافی ہوں خواہ ان کا منبع قرآن و حدیث ہی کیوں نہ ہو۔ ان کے خیال میں ایسی فوق الفطرت باتوں کو تمثیلی سمجھنا چاہیئے جو محض استعارہ کے طور پر بیان کی گئی ہیں۔ انہوں نے غیر عقلی امور کو منطقی انداز میں بیان کرنے کے فن کو "علم کلام" کا نام دیا۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو معتزلہ کا قرآن کے متعلق نقطہ نظر بڑا جاندار ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ قرآن کا ہر ایک لفظ ابتدائے کائنات ہی سے مرقوم ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر انسانی حرکت ایک اٹل تقدیر کی پابند ہے جس کے سبب بشر محض ایک مشین ہے جسے اپنے عمل پر قطعاً کوئی اختیار نہیں۔۔۔۔ اگر یہ سچ ہے تو وحی سراسر بیکار ہے جس کا مقصد انسان کو ہدایت دینا ہے۔ اگر ہدایت طبعاً بیکار ہے تو ہدایت بھیجنے کا مطلب؟ اس طرح ایمان و کفر کی تمیز بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے اور یوم محشر جیسے تصورات کی نفی ہو جاتی ہے کیونکہ اس طرح فرد کو اپنے اعمال پر اختیار نہیں رہتا۔

ابوالحسن اشعری (873 - 935) جو دس برس تک معتزلی اصولوں کے مدرس رہے۔ آخر کار ان کے خلاف ہو گئے اور جبریہ تعلیمات کے معلم بن کر رہ گئے۔ ان کے خیال میں اللہ ایک آمر مطلق ہے۔ وہ جو چاہے کرتا ہے اسی لئے اس نے ہر چیز کی تقدیر مقرر کر دی ہے اور کسی کو اپنے عمل پر اختیار نہیں۔ امت مسلمہ اسی وجہ سے غیر منطقی خیالات کی زد میں آ کر طرح طرح کے توہمات کا شکار ہو چکی ہے اور یہی اس کی ذہنی، علمی اور اخلاقی پستی کا سبب ہے۔

اگر علامہ اقبال کے نظریات کو غور سے دیکھا جائے تو انہیں متکلم کا درجہ بھی نصیب نہیں ہوتا۔ ان کی شاعری فلسفیانہ گہرائی سے تہی دست اور جذباتی سراب سے بھرپور نظر آتی ہے۔ یہ نتیجہ ہے ان کی عقل شکنی اور عشق پرستی کا۔ فرماتے ہیں:

خوار جہاں میں کبھی ہو نہیں سکتی وہ قوم
عشق ہو جس کا جسور۔ فقر ہو جس کا غیور

ہے ابد کے نسخہ دیرینہ کی تمہید عشق
عقل انسانی ہے فانی۔ زندہ و جاوید عشق

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

عقل کو تنقید سے فرصت نہیں
عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ

عقل گو آستاں سے دور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں

یاد رکھنا چاہیئے کہ مسلمانوں کا یہ دعویٰ کہ انہوں نے یورپ کو تہذیب سکھائی۔ اس کی بنا نہ تو عقلی اور علمی برتری پر ہے جو اس وقت اہل مغرب کو مسیحی تعلیمات کی عقل دشمنی کے باعث میسر نہ تھی۔ مسلمانوں کا ذہنی ارتقا خلیفہ المامون کے دور 813 میں شروع ہوا۔ عربوں نے تین بیدار مغز خلفا۔ المنصور۔ الرشید۔ اور المامون پیدا کئے۔ موخر الذکر نے اپنی علمی خدمات کے ذریعے عالم اسلام کی ذہنی وسعت کو انتہائی بلندیوں تک پہنچا دیا۔

المامون ہر منگل وار کو بزم مباحثہ منعقد کرتا تھا جس میں ہر فرقہ کے علما کو اظہار فکر کی پوری آزادی دی جاتی تھی۔ ان محفلوں کا موضوع بحث۔ مذہب اور قانون ہوتا تھا اور وہ ایک عام عالم کی طرح ان میں حصہ لیتا تھا جس میں اس نے شاہی وقار و تمکنت سے ہمیشہ ہی گریز کیا۔ یہی وہ حکمران ہے جس نے ہندی۔ یونانی اور ایرانی مسودات کے عربی زبان میں تراجم کرا کر بیت الحکمت کی بنیاد رکھی اور مسلمانوں کو ذہنی و عقلی ارتقا کی منازل سے آشنا کیا۔ ابتدا میں المامون انتہائی آزاد خیال تھا لیکن آخری دور اقتدار میں وہ بھی اپنے حواریوں کے چنگل میں پھنس گیا۔ اس نے اپنی آزاد روی کو عوام پر مسلط کرنے کے لئے کئی قوانین جاری کئے جن کی رو سے لازم ہو گیا کہ مسلمان قرآن کی ابدیت پر یقین نہ رکھیں۔ اصول تقدیر کو نہ مانیں۔ جو ان اعتقادات کو تسلیم نہ کرے انہیں عدالتوں میں گواہی دینے کے حق سے محروم کیا جائے اور اس بات کو کفر قرار دیا جائے کہ ذات حقیقی کو آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اتنا ہی نہیں لوگوں کے اعتقادات کو پرکھنے کیلئے اس نے ان کا امتحان لینے کا سلسلہ جاری کیا۔

المامون 833 میں فوت ہوا۔ اس کے جانشینوں۔ بالخصوص المعتصم اور الواثق نے اس کا کام جاری رکھا لیکن ابن حنبل نے اس شدید طریق کار کے متعلق احتجاج کیا۔ جب اس کے اعتقادات کا جائزہ لینے کے لئے اسے آزمائش نامہ دیا گیا تو اس نے سوالات کا عقلی حل تلاش کرنے کے بجائے ہر بات کے جواب میں قرآن سے اقتباسات پیش کئے۔ اسے سزا کے طور پر کوڑے لگائے گئے اور جیل میں بند کیا گیا۔ اس کی موت نے اسے لوگوں کی نظر میں شہید اور ولی کا درجہ دیا اور اس طرح عالم اسلام میں عقلیت کے خلاف عقیدت مندی کی تحریک شروع ہو گئی جو اوہام پرستی۔ خود فریبی اور رجعت پسندی کا سرچشمہ ثابت ہو کر وقار اسلام کو لے ڈوبی۔ یہ ایسی ضرب تھی جو ہلاکو خان کے دیئے ہوئے گھاؤ سے کہیں زیادہ مہلک تھی۔ اس نے تو صرف عرب سیاسی اقتدار کو ختم کیا۔ اشاعرہ کی عقل دشمن تحریک نے اسلام کی اجتہادی روح کو بری طرح منسلوب کر دیا اور یہ ایک ارتقا پذیر اور روشن خیال اقدار کا علمبردار نہ رہ سکا۔ دراصل اسلام یوں ڈگمگانے لگا کہ اس کے قدم تنگ نظری۔ ذہنی پستی اور علمی و تمدنی دلدل میں اس طرح دھنسنے لگے کہ پھر یہ ہمیشہ ہی دھنستا چلا گیا۔

کہتے ہیں ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ چرب زبان اور انا پرست افراد کے لئے۔ مسلمانوں کی نفسیاتی کمزوری کا انتفاع کرنے کا یہ سنہری موقعہ تھا۔ انہوں نے عوام کو جذباتی منجدھار میں الجھا کر ساحل مراد سے اور بھی دور کر دیا اور اس طرح خود ان کے روحانی اور تمدنی راہنما بن کر امر ہو گئے۔ انہوں نے اس سلسلے میں تضحیک عقل اور تشہیر عشق کو اپنا بنیادی اصول بنایا۔ ان غارت گران اسلام میں اقبال پیش پیش تھے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی وحدت کو پارہ۔ پارہ کر کے انہیں تین متحارب قومیتوں یعنی بھارتیوں۔ پاکستانیوں اور بنگلہ دیشیوں میں تقسیم کرنے کا "سہرا" انہی کے سر ہے۔

قرآن کی بنیاد اصول وحی پر ہے یعنی خدا اپنے بندوں کی راہنمائی کے لئے پیغمبروں کے ذریعے ہدایت بھیجتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ ہدایت حیوانوں یعنی گدھوں اور گھوڑوں پر نازل نہیں کرتا کیونکہ ان میں اتنی عقل ہی نہیں کہ پیغام الٰہی کو سمجھ سکیں۔ لہٰذا وحی کا عقل سے بنیادی تعلق ہے جو انسانوں کا ایک بڑا خاصہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا۔ فرائض وحی کی ادائیگی کے لئے کسی

کم عقل شخص کو منتخب نہیں کرتا اور اس لئے نبی اپنے زمانے کا ایک انتہائی زیرک انسان ہوتا ہے جس میں سنجیدگی اور دانش مندانہ توازن کا عنصر بدرجہ اتم موجود ہوتا ہے۔

اس کے برعکس عشق۔ عقل دشمنی۔ خود فریبی اور فنافی النفس کا دوسرا نام ہے جس کی بنا جذبات پرستی۔ عقلی کجروی اور تضحیک فراست پر ہے۔ اس رجحان کے اثرات انتہائی خطرناک ہیں جو انکار علم اور پرستش اوہام سے لازم آتے ہیں۔ ان حقائق کے پیش نظر اقبال کے اس شعر کا مدعا بخوبی سمجھ میں آتا ہے۔

قلندر جز بحرف لاالہ کچھ بھی نہیں رکھتا　　　　فقیہہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

بظاہر یہ شعر اسلام کی تفسیر ہے لیکن در حقیقت یہ اس کی تکفیر ہے کیونکہ جب تک اس میں رسالت محمدی کو شامل نہ کیا جائے۔ اسلام دین الہیہ کا درجہ اختیار کر ہی نہیں سکتا۔ اقبال کے جذباتی انداز نے جس طرح فکر مومن کو مجروح کیا ہے یہ اس کی ایک ادنے مثال ہے۔ قلندری ایک غیر اسلامی نظریہ ہے جس کی جڑیں تصوف یعنی نظریہ عشق میں گڑھی ہوئی ہیں۔ اس کے بنیادی تصورات اور طریق عبادت بدھ مت سے ماخوذ ہیں جو طلوع اسلام سے پیشتر ایران۔ افغانستان۔ ترکستان اور گندھارا کے علاقوں میں رائج تھا۔ اسلام کی اساس کو اسلام پرستی کے نام پر منہدم کرنا۔ کلام اقبال کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس سلسلے میں اقبال غزالی۔ رازی اور رومی کا مقلد ہے۔ ان لوگوں کے خیالات پر روشنی ڈالنے سے پہلے ابو علی الحسین ابن سینا اور ابو الولید محمد ابن احمد ابن محمد ابن رشد کی فلسفہ طرازی پر نگاہ اس لئے ڈالنا چاہیئے کہ یہ دونوں ہی عقلیت کا احترام کرتے تھے اگرچہ انہیں تصوف سے بھی سروکار تھا۔ اس بات کی وضاحت کرنے کے لئے کہ اسلام میں عقلی نقطہ نظر کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان دو مسلم دانشوروں کے نظریات پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ پہلے ابو علی سینا کو لیجیئے:

ابو علی سینا 980ء میں بخارا میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق اسماعیلی فرقے سے تھا۔ وہ ایک اجل عالم اور تیز فہم انسان ہونے کے علاوہ حکمت میں یکتائے روزگار تھے۔ ان کے تصورات تصوف کا نہ صرف دنیائے اسلام پر گہرا اثر ہوا بلکہ ان کے طرز فکر نے ان مغربی مفکرین کے اذہان پر بھی گہرے نقوش چھوڑے جو SCHOLASTICS کے نام سے مشہور ہوئے اور جن کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ وہ ارسطو اور الفرابی★ سے بڑے متاثر تھے۔

★محمد ابو نصر الفرابی پہلے ترک تھے جنہوں نے میدان فلسفہ میں نام پیدا کیا۔ وہ ترکستان کے شہر فراب میں پیدا ہوئے۔ ان کے علم کا سرچشمہ بھی ارسطو ہی تھا۔ انہوں نے ارسطو کی فزکس کا چالیس مرتبہ اور ڈی اینیما (DE ANIMA) کا دو سو مرتبہ مطالعہ کیا۔ نتیجتہً انہوں نے صوفی لباس اور اصولوں کو اپنایا اور تارک الدنیا ہو گئے۔ علمائے بغداد نے ان کے اعتقادات کو غیر اسلامی قرار دیتے ہوئے ان کی مذمت کی اور ان پر کفر کا فتویٰ عائد کیا۔ اس کی وجہ ان کی ارسطو کی اندھی تقلید تھی جو اس نے مابعد الطبیعات کے سلسلے میں اختیار کی

حقیقت یہ ہے کہ دنیائے اسلام کے ان ممتاز اہل علم کو بھی فلسفی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ فلسفی ہونے کے لئے اشد ضروری ہے کہ اس کی سوچ عقیدے اور اوہام کی زنجیروں سے قطعاً آزاد ہو کیونکہ اس کے بغیر ایک آزادانہ نظام فکر پیش کرنا ناممکن ہے۔ جو کہ ایک فلسفی کی پہچان ہے اور یہی فلسفی کو ایک مفکر سے متمیز کرتی ہے۔ اسی لئے جنہیں دنیائے اسلام میں "فلسفی" کہا جاتا ہے وہ منفرد نظام فکر کے حامل نہ ہونے کے سبب صرف "مفکر" ہی کہلا سکتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن اس طرز فکر کی اجازت نہیں دیتا جو اس کے بنیادی اصولوں سے ٹکراتی ہو۔

ابو علی سینا نور دانش کے قائل تھے۔ ارسطو کی پیروی کرتے ہوئے انہوں نے مادہ کی ابدیت کا اعلان کیا جس سے اصول اسلام کی نفی لازم آتی ہے کیونکہ اس پر یقین کرنے سے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ کوئی خالق خدا ہے ہی نہیں۔ اس طرح وحی یعنی سلسلہ ہدایت الٰہیہ۔ انبیا کے وجود اور یوم محشر جیسے اعتقادات سے انکار کرنا پڑتا ہے۔

متکلمین۔ جن کا پیشہ ہی تاویل کے زور سے فلسفہ کی تردید اور مذہب کی تائید کرنا تھا۔ بو علی سینا کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ وہ ذہنی اور علمی اعتبار سے ایک عظیم شخصیت تھے چنانچہ انہوں نے اپنے اصول کی عقلی تشریح کرتے ہوئے اعلان کیا کہ مادہ ابدی ہے۔ اگرچہ وقتی لحاظ سے خدا کو مادہ پر تقدم حاصل نہیں۔ منطقی طور پر اسے موخر الذکر پر فوقیت حاصل ہے کیونکہ وہ معراج۔ اصلیت اور علت اولیٰ ہونے کے سبب تمام کائنات کی اساس ہے اور کاروبار ہستی اس (خدا) کی ان خوبیوں کے بغیر نہیں چل سکتا۔ ابو علی سینا کو اعتراف کرنا پڑا کہ کسی چیز کا وجود بھی مشیت ایزدی کے بغیر ممکن نہیں۔ بالفاظ دیگر اگرچہ خدا خالق نہیں۔ اشیا کی تدوین ذات باری کی مرضی ہی سے ممکن ہے۔ خدا اس لئے علت (CAUSE) اور جہان معلول (EFFECT) ہے۔

اس نے مزید براں یہ کہا کیونکہ مادے کا وجود انحصاری ہے یعنی خود بخود برقرار نہیں رہ سکتا اس لئے اسکے لئے ایک علت کی ضرورت ہے۔ جو خدا ہے جس کا بغیر علت کے یعنی خود بخود ہونا لازم ہے لہذا خدا ایک ست یعنی جوہر ہے۔ جو مادی خواص سے بالکل مبرا ہے۔ علاوہ ازیں چونکہ ہر شے میں دانش کی جھلک موجود ہے خدا عقل کل ہے۔ جو ماضی۔ حال اور مستقبل کو الگ الگ نہیں بلکہ بیک وقت دیکھتا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ قیود زماں سے بالکل آزاد ہے۔

البتہ خدا تخلیقی امور اور تاریخی حوادث کا ذمہ دار نہیں۔ یہ باتیں خود بخود رونما ہوتی ہیں اور اشیا کے ان فطری مقاصد کا نتیجہ ہیں جو ان کے طبعی ڈیزائن میں مخفی اور ان کے وجودی چین کا محرک ہیں۔ اس لئے دنیا میں جو برائی پائی جاتی ہے خدا اس کا ذمہ دار نہیں۔ یہ ہماری اپنی قوت ارادی (FREEWILL) کی پیداوار ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ جزو کی برائی۔ کل کی بھلائی کا باعث ثابت ہو۔

اپنے فلسفیانہ اصول کی تشریح کرتے ہوئے (جو ارسطو سے مستعار تھی) ابو علی سینا نے کہا کہ روح کا ادراک ہماری مشیت میں پنہاں ہے اور اسی لئے روح کی اصلیت مادی نہیں۔ روحانی ہے۔ یہ مادے سے اسی طرح مختلف ہے جیسے ہمارے خیالات ہمارے (مادی) جسم سے بالکل جدا ہوتے ہیں۔ روح دراصل ہمارے جسم کی طبعی حرکت اور نشو و نما کا ایک بنیادی اصول ہے۔ اسی نقطہ نظر سے اجرام فلکی کی بھی روح ہے (جو ان کی حرکت اور اثبات کی ضامن ہے) اسی لئے تمام کائنات ایک عالمگیر

اصول حیات (روح) کا مظہر ہے۔ بذات خود جسم کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ روح ہی اس کی قوت محرکہ ہے۔ ہر ایک روح جزو دانش ہے اور اس میں روح اوّل کی طرح آزادی اور کارسازی کا جوہر موجود ہے اگرچہ وہ محدود ہے۔

موت کے بعد پاکیزہ ارواح اتصال کے لئے عالمگیر روح کی طرف رجوع کرتی ہیں اور یہ وصال الٰہی اچھے کاموں کی برکت کا نتیجہ ہے۔

ابو علی سینا اگر زنجیر عقائد کے اسیر نہ ہوتے تو وہ متکلم کے بجائے ارسطو سے کہیں بڑے فلسفی ہوتے۔ ان کی تحریروں سے عیاں ہے کہ وہ سریانی فلسفہ کے قائل تھے جس میں خدا کو خالق کی حیثیت حاصل نہیں۔ کائنات کو اصول وحدت الوجود کا مظہر سمجھا جاتا ہے اور انفرادی روح کا عالمگیر روح میں گھل مل جانا۔ انسانی زندگی کی معراج تصور کیا جاتا ہے۔

اس بحث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ابو علی سینا عقل کی عظمت کے نہ صرف قائل بلکہ مبلغ بھی تھے۔ روح کو دانش اور اسے عقل کل (خدا) کا جزو قرار دینا۔ ان کی فلسفیانہ رفعت کی ہی دلیل نہیں بلکہ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایسے دیانت دار شخص تھے جنہیں دنیاداری کی کوئی لالچ نہیں تھی۔ انہیں اپنی انا کے بجائے خدمت خلق کا شوق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ صوفی مزاج ہونے کے باوجود انہوں نے عشق کا ڈھونگ نہیں رچایا۔ اگر خدا عقل کل ہے اور روح جزوی عقل ہونے کے باعث وصال ایزدی (روح کل) کی متلاشی ہے تو اس سے تصور عشق کی کمتری ثابت ہے۔ بالفاظ دیگر خدا یعنی عقل کل۔ انسان (جزوی عقل) کی منزل مقصود ہے لہذا بشر اس تک چراغ عقل کی روشنی ہی میں پہنچ سکتا ہے۔ عشق۔ ایک جنونی کیفیت کا نام ہے۔ جو عقل کی ضد ہونے کے باعث تاریکی اور بے یقینی کا دوسرا نام ہے۔

نہ جانے اقبال نے اصول اسلام کی تردید۔ اسلام پرستی کے پردے میں کیوں کی۔ اس کا سبب انا پرستی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ کتنا سراسر اسلام شکنی ہے کہ:

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو تو مرد مسلماں بھی کافر و زندیق

تازہ مرے ضمیر میں معرکہ کن ہوا
عشق تمام مصطفیٰ! عقل تمام بولہب

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغ راہ ہے۔ منزل نہیں ہے

نہ صرف بد تمیزی بلکہ تضحیک اسلام کی انتہا ملاحظہ ہو:

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا اپنا گریباں چاک۔ یا دامن یزداں چاک

اقبال وحدت الوجودی تھے۔ مثلاً

کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی
جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں چمک ہے

حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا نکلے اگر ذرے کا دل چیریں

جس کی نمود دیکھی چشم ستارہ بیں نے
خورشید میں ۔ قمر میں ۔ تاروں کی انجمن میں

صوفی نے جس کو دل کے ظلمت کدے میں پایا
شاعر نے جس کو دیکھا قدرت کے بانکپن میں

ہر شہ میں ہے نمایاں یوں تو جمال اس کا
آنکھوں میں ہے سلیمیٰ! تیری کمال اس کا

(دیکھئے پوری نظم بعنوان سلیمیٰ۔ بانگ درا)

ایک وحدت الوجودی کی آخری منزل وصال الٰہی ہے لیکن اقبال کی متضاد ذہنیت ملاحظہ ہو کہ وہ روز محشر پر بھی یقین رکھتے ہیں جب وہ جنونی کیفیت میں دامن یزداں ہی چاک کر ڈالیں گے۔ ایک جنونی سے ناشائستگی کے علاوہ اور کس بات کی توقع رکھی جا سکتی ہے؟

آیئے اب ابو الولید محمد ابن احمد محمد ابن رشد کے افکار پر نظر ڈالتے ہیں:

ابن رشد (1126 - 98) کو ابن طفیل نے 1153ء میں ابو یعقوب یوسف کے دربار میں پیش کیا۔ ابن رشد کے دادا اور والد دونوں ہی قرطبہ کے قاضی القضات رہ چکے تھے۔ امیر یوسف ایک عالم انسان اور فلسفہ کے مداح تھے۔ انہوں نے جواں سال ابن رشد کی ذہانت اور علم کو پرکھنے کے لئے ان سے پوچھا "آسمانوں کی نوعیت کیا ہے؟ کیا وہ ابدی ہیں یا ان کا کوئی نقطہ آغاز ہے"۔

ابن رشد ان سوالات سے سراسیمہ ہوئے تو امیر یوسف نے ان کی دلجمعی کے لئے خود ہی ان کی وضاحت کر دی لیکن امیر موصوف باقی انٹرویو سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے ابن رشد کو ایک گرانقدر رقم۔ ایک گھوڑا اور نہایت قیمتی خلعت عطا کی۔

عیسائی اور یہودی دنیا نے ابن رشد کی کہیں زیادہ تعظیم کی ہے۔ نہ صرف وہ ایک فلسفی سمجھے جاتے تھے بلکہ وہ ایک ماہر قانون۔ ایک عظیم طبیب اور بہت بڑے شارح علم و ہنر بھی تھے۔ یورپ کی یونیورسٹیاں عیسائی اور یہودی مذہبی ادارے ان کے نظریات و فنون کے قدر دان تھے۔

ابن رشد ایک زیرک اور حقیقت پسند انسان تھے۔ انہیں اس بات کا احساس تھا کہ عوام کو اتنی فرصت ہی نہیں کہ وہ فلسفہ کی گہرائیوں میں غوطہ زن ہو کر صدف صداقت کو ڈھونڈ سکیں۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ لوگ زندگی کے تلخ حقائق کو بھولنے کے لئے مذہب کے غیر منطقی اعتقادات کا سہارا لیتے ہیں اور اس طرح خود فریبی کی وساطت سے ذہنی سکون حاصل کرتے ہیں۔ ان کے دفاع مذہب کی یہی بڑی وجہ ہے۔ وہ اس حصار کو ہر قیمت پر ٹوٹنے سے بچاتے ہیں۔ مذہبی اعتقادات کے انہدام سے عوام کی نفسیاتی پریشانی کا آغاز ہوتا ہے۔ اس لئے وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ اگر دینی اصولوں کو استعارۃً بیان کیا جائے تو مذہب اور سائنس کے درمیان مطابقت پیدا کی جا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے خیالات کو بلا واسطہ ایسے انداز میں پیش کرنا جس کا تبلیغ سے کوئی تعلق نظر نہ آئے ان کے اسلوب بیان کی خاصیت بن کر رہ گیا۔

ان کے خیال میں فلسفہ کے معنی ہستی کے مقاصد پر غور کرنا اور اسے عوامی بہبود کے لئے استعمال کرنا ہے۔ اپنے بنیادی نظریات کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ کائنات ابدی و ازلی ہے۔ نہ کبھی اس کی ابتدا ہوئی اور نہ ہی کبھی اس کا

اختتام ہو گا۔ تخلیق محض ایک افسانہ ہے۔

نظریہ تخلیق کے حامیوں کی رائے میں ہستی کا منبع نیستی ہے یعنی اشیا ان اجزا کے بغیر وجود میں آسکتی ہیں جو خود ہی کالعدم ہیں۔ یہ محض مذہبی خیال آرائی ہے۔۔۔۔ حرکت دائمی اور مسلسل ہے اور ہر حرکت کا ایک محرک ہے جو پہلے سے موجود ہے۔ حرکت (گردش) کے بغیر وقت کا تصور ممکن نہیں اور ہم اس بات کا خیال تک نہیں کر سکتے کہ حرکت کی کوئی ابتدا یا انتہا ہے۔ البتہ خدا کو کائنات کا خالق اس لحاظ سے قرار دیا جا سکتا ہے کہ یہ اس کے سہارے کے بغیر ایک پل کے لئے سلامتی سے ہمکنار نہیں رہ سکتی اور اس کا دوام قوت الہیہ کا محتاج ہے۔ خدا کائنات کا خالق نہیں بلکہ وہ اس کی نظمیہ شکتی۔ بقا اور دانش ہے۔

یہی وہ عظیم ترین نظمیہ شکتی اور عقل کل تمام سیاروں اور ستاروں میں نظم اور دانش کی صورت میں رواں دواں ہے۔ دانش دو قسم کی ہے۔ کارگر (ACTIVE) اور مجہول (PASSIVE) آخر الذکر کا تعلق سب سے نچلے آسمانی حلقوں (مثلاً چاند) سے ہے جو انسانی اجسام و اذہان کو انفرادی طور پر متحرک کرتی ہے۔ بشری ذہن دو عناصر سے تشکیل کیا گیا ہے: ایک مجہول ہونے کے باعث مادی دانش کا درجہ رکھتا ہے جس میں خیال آرائی کی اہلیت موجود ہے چونکہ یہ بدن کا حصہ ہے اس لئے جسم کے ساتھ اس کی موت بھی واقعہ ہوتی ہے۔

دوسری قسم کی دانش یعنی عقل کارگر (ACTIVE INTELLECT) دراصل یزدانی سرایت ہے (جو اجسام میں داخل ہو کر) مجہول دانش کو تحرک بخشتی ہے۔ دانش کارگر انفرادی وجود کی پابند نہیں۔ یہ ہر فرد میں یکساں اور غیر فانی ہے۔ اس انفرادی دانش کا یہ طبعی خاصہ ہے۔ کہ وہ دانش کل سے وصال کی متلاشی رہتی ہے اور اس میں جذب ہونے کو اپنی ہستی کی انتہا تصور کرتی ہے۔ اس کیفیت وصال میں انسانی ذہن یزدانی خواص حاصل کر لیتا ہے اور اس طرح اسے اصولاً (POTENTIALLY) تمام کائنات کا ادراک ہو جاتا ہے جس کا کوئی حقیقی وجود نہیں۔ یہ جو بوقلمونی ہمیں نظر آتی ہے صرف ہمارے ذہن کی پیداوار ہے۔

وصال یعنی انفرادی دانش (انسان) کے دانش کل (خدا) میں جذب ہونے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے صداقت کی پہچان عقل کے ذریعے ہے۔ اہل تصوف کا مجوزہ طریق وصال جو ترک دنیا اور نفس کشی پر مبنی ہے۔ محض ایک ڈھونگ ہے۔

جب کوئی قوم انحطاط پذیر ہو جائے تو وہ عقل دشمن بن جاتی ہے اور اس کا اوہام پرستی سے رابطہ اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ وہ حقیقت کو افسانہ اور افسانہ کو حقیقت قرار دینے لگتی ہے۔ مسلمانوں کے زوال کا سبب سیاسی نہیں۔ ذہنی پستی تھی جو ان کی اخلاقی گراوٹ کی وجہ بنی۔ مغرب کی ترقی یافتہ تہذیب اور دنیائے اسلام کے رجعت پسند تمدن سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ یہ اسی دانش دشمنی کا نتیجہ تھا کہ 1150 میں خلیفہ بغداد نے ابو علی ابن سینا کی تمام کتب جلا دینے کے احکامات جاری کئے اور امیر ابو یوسف المنصور نے ابن رشد کی تمام فلسفیانہ کتب کو راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔ بارہویں صدی عیسوی کے بعد

دنیائے اسلام میں کوئی ایسا مفکر پیدا نہ ہوا جو اس ملت کو بدلتے ہوئے حالات کے مطابق نئی راہ دکھا سکے۔ اس کے برعکس عالم عیسائیت نے ان دو مسلم مفکرین کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے افکار سے استفادہ کیا۔

ابتدا میں اسلام کا سب سے بڑا گن اس کی سادگی تھی جسے زیور عمل سے آراستہ کیا گیا۔ عربوں کا بلا تامل ہر وقت جہاد کے لئے تیار رہنا اس حقیقت کی دلیل تھی۔ اسلام نام تھا چند عام فہم بنیادی اصولوں کا جنہیں سمجھنے کے لئے نہ کسی گہری سوچ بچار اور نہ تاویل بازی کی ضرورت تھی اس لئے یہ کہنا بجا ہے کہ اسلام میں فلسفہ کی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ یہ فلسفیانہ تحقیق اور موشگافی کا متحمل نہیں ہو سکتا البتہ اپنی سادگی۔ سلامت اور اختصار کے باعث یہ دنیاوی کاروبار اور ترقی کی راہ میں حائل نہیں لیکن دخول تصوف نے اس کے مزاج۔ ہیت ترکیبی اور چلن کو بالکل منقلب کر ڈالا جس کے باعث باطنیت نے اصلیت۔ نفس کشی نے زہد اور راہبانہ اطوار نے مجاہدانہ کردار پر غلبہ پالیا۔

اگرچہ اسلام فلسفہ سے بے تعلق ہے اس دین کو ماننے والوں میں عقل و فراست کی کمی نہیں جو قطرہ میں دجلہ و فرات کی گہرائی دیکھنے کی عادی ہے۔ غالباً اکثر لوگوں کو اس بات کا احساس نہیں کہ تصوف فلسفہ کی ایک شاخ ہے۔ انا پرستوں نے بعض قرآنی آیات کی غلط تاویلیں کر کے انہیں روح اسلام قرار دیا۔ جس کی بنیاد نظریہ عشق پر اٹھائی گئی ہے۔

تصوف کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ میں اس حقیقت پر متعدد مضامین میں بحث کر چکا ہوں اور اپنے مقالہ "اقبال اور قلندری" میں بھی اس پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔ اگرچہ یونان میں اس کی بڑی آؤ بھگت ہوئی اس کی حقیقی جنم بھومی ہندوستان ہے اور اس کی اساس عشق نہیں عقل ہے۔ ابو علی ابن سینا اور ابن رشد کے افکار مشہور یونانی فلسفی ارسطو سے ماخوذ ہیں جو افلاطون کا شاگرد تھا لیکن ان کی فلسفہ طرازی نوے فیصدی ویدوں سے مستعار ہے جو ہندی دانش وروں (نہ کہ ہندوؤں) کی تدوین ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ویدوں میں لفظ ہندو ڈھونڈنے سے نہیں ملتا۔ نہ ہی ان میں رام۔ کرشن۔ ہنومان کا ذکر ہے اور نہ ہی بت پرستی کی تلقین۔ ہندوؤں کا عقیدہ و عمل ویدوں کے بالکل خلاف ہے پھر بھی انہیں ہندوؤں کی مقدس کتابیں کہتے ہیں حالانکہ یہ متحدہ ہندوستان کی مقدس کتابیں ہیں۔ مزید براں بھارت۔ پاکستان اور بنگلہ دیش کے لوگ جس تمدن پر عمل پیرا ہیں اس کی اکثر روایات کا منبع وید ہی ہیں۔ ان لوگوں نے ویدوں کو اس لئے طاق نسیاں کی زینت بنا دیا ہے کہ ان کے بلند اصولوں پر عمل کرنا ان کے بس کی بات نہیں رہی۔ ان کا اخلاقی قد اس قدر چھوٹا ہو چکا ہے کہ مسلسل غلامی کے باعث انہیں اپنی اصل سے گھن آنے لگی ہے۔ مسلمان تو ایک طرف رہے ایسے ہندوؤں۔ سکھوں اور عیسائیوں کی بھی کمی نہیں جو اپنے آپ کو بیرونی حملہ آوروں کی اولاد قرار دیتے ہیں۔ قومیں وطن سے بنتی ہیں۔ جو لوگ صدیوں سے برصغیر ہند میں رہنے کے باوجود بھی خود کو ہندی النسل نہیں سمجھتے ان کے دماغ یقیناً فتور کا شکار ہو چکے ہیں۔ یہ محض کسر نفسی کا بہانہ ہے۔ یہ سید۔ مغل۔ ہن اور بطرے ذرا ان ملکوں میں جا کر دیکھیں جن کے ساتھ انہیں قومی ربط کا گمان ہے تو ان کی آنکھیں حیرت سے کھل جائیں۔

کبھی ہندوستان دانش کا مرکز تھا جو اس بات سے ثابت ہوتا ہے کہ وید کے لفظی معنی ہی "علم" ہیں جس کا تعلق عقل و

واستدلال سے ہے۔ "ودوان ۔ بمعنی عالم۔ عقل مند۔ ذہین " اسی سے مشتق ہیں۔ "ودیا" کا مادہ بھی یہی ہے جس کے معنی ہیں" علم۔ فن۔ سائنس۔ فلسفہ "۔

"بدھی" بھی اسی سے۔ ماخوذ ہے جس سے ہندی میں مراد" عقل۔ دانش۔ ادراک "ہیں۔ دنیا کے عظیم دانش ور انسان۔ سدھارتھ کو مہاتما بدھ اسی لئے کہتے ہیں کہ انہوں نے نجات (نروان) کا ایک عظیم عقلی نظام پیش کیا جسے بدھ مت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اس کے آج بھی دنیا میں کروڑوں مقلدین ہیں جو اپنے عقلی اصولوں کے باعث ایسے اوہام کا شکار نہیں ہوئے جس سے انسان ماؤف الدماغ ہو کر تہذیبی پستی کی ڈھلوان پر چل نکلتا ہے۔ میری مراد مشرق بعید کے ممالک چین۔ جاپان۔ کوریا وغیرہ سے ہے جن کا شمار آج بھی ان بستیوں میں ہے جن سے اہل مغرب لرزتے ہیں۔

اقبال ہندی نسل سے تعلق رکھتے تھے ان کے دادا کشمیری برہمن تھے۔ "علامہ" ہونے کی نسبت سے انہیں معلوم ہونا چاہیئے تھا کہ وید جو تمام اہل ہند کی بلا تخصیص مذہب۔ تمدنی روایات کے حامل ہیں۔ عقل و استدلال کے حامی ہیں۔ ان میں ایمان بالغیب کو قطعاً کوئی دخل نہیں۔ نبوت اور فرشتوں کی صداقت کا اقرار کئے بغیر بھی ہر فرد راستی عمل سے مکتی (نجات) حاصل کر سکتا ہے جس سے مراد انفرادی روح کا روح عالم (پرماتما) سے وصال ہے۔ اور یہ وہی اصول ہے جو یونانی فلسفیوں نے اپنایا۔ اتفاق سے جب خلیفہ المامون نے تراجم کے ذریعے بیت الحکمت کی بنیاد ڈالی تو کسی کو بھی افلاطون اور ارسطو کے عرفانی نظریات کا پس منظر جاننے کی فرصت نہ ملی اور اس طرح ان کی ہندی حقیقت اجاگر نہ ہو سکی۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب عرب سیاسی طور پر تو بیدار ہو چکے تھے اور ان کی تلوار مشرق و مغرب میں اپنے قوی جوہر دکھا رہی تھی لیکن قرآن و حدیث سے انتہائی عقیدت مندی کے باوجود وہ علمی و ذہنی طور پر ابھی تک عالم طفولیت میں تھے اور ان پر یونانی کلچر کا گہرا اثر تھا۔ نہ صرف جنوبی عرب یعنی یمن میں یونانی بت پرستی کی مثالیں ملتی ہیں بلکہ دیار محمد یعنی مکہ میں بھی لات۔ منات اور عزیٰ کی پوجا کی جاتی تھی جن کا تعلق یونانی تہذیب سے ہے لہذا جن روایات کو یونانی سمجھا جاتا تھا ان سے اسلامی اصولوں کے لئے سند حاصل کرنا۔ مسلم متکلمین کا ایک دلچسپ مشغلہ بن کر رہ گیا۔ اسلامی تصوف پر سقراط کا گہرا اثر ہے لیکن یہ مسلک یونانی النسل نہیں ہندی نژاد ہے اور اس کا ثبوت ویدوں میں قدم۔ قدم پر ملتا ہے۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ رگ وید کی عمر کئی ہزار قبل مسیح ہے جب کہ یونانی فلسفہ کی روایت چھ سو سال قبل مسیح سے زیادہ نہیں۔ اس لئے تصوف جو فلسفہ کی ایک شاخ ہے۔ ویدازم کی ایک شاخ اور اسلام کے خلاف ایک چھپی بغاوت ہے۔ اگر یقین نہ آئے تو مندرجہ ذیل پر نگاہ ڈال کر دیکھ لیجیئے۔

ا۔ یہ جگت جتنا ہے اتنا ہی رہے گا۔ (رگ وید 2. 92: 10

جگت یعنی کائنات جو۔ دوسے تشکیل ہے جتنی ہے اتنی ہی رہے گی یعنی مادہ کی مقدار مقرر ہے۔ جو نہ بڑھائی جا سکتی ہے اور نہ گھٹائی جا سکتی ہے یعنی یہ عالم جیسا ہے ہمیشہ ویسا ہی رہے گا۔

★ جو کچھ بھی ہے (اے خدا) تو نے بنایا اور یہ ہمیشہ ایسا ہی رہے گا" (رگ وید 2. 55: 10)

"آسمان اور زمین اسی طرح ہمیشہ قائم رہیں گے" (1. 52: 10)۔

یہی نظریہ یونانی فلسفیوں اور صوفیوں کا ہے۔

۲۔ "اس سنسار کا منبع پرمشیور (خدا) ہے۔ یہ اسی کی آنکھ ہے جو اس پر قابو رکھتی ہے۔ اسے اس نے تخلیق کیا ہے یا نہیں۔ یہ صرف وہی جانتا ہے" (رگ وید 7. 29: 10)

رگ وید کا شلوک 3. 81: 10 نظریہ تخلیق کی یوں تشریح کرتا ہے:

"وہ جو خدائے مطلق ہے اس نے ویلڈ کر کے زمین اور آسمان کو پیدا کیا"۔

بالفاظ دیگر جس طرح ایک ویلڈر (WELDER) مختلف موجودہ حصوں کو ٹانکا لگا کر ایک نئی چیز یا مشین بناتا ہے اسی طرح خدائے مطلق نے بھی مادی اجسام کو جوڑ کر زمین اور آسمان پیدا کئے۔

بالکل یہی نقطہ نظر یونانی فلسفیوں کا ہے جو خالق خدا کو نہیں مانتے۔

۳۔ جیسا کہ بالائی اقتباس سے ظاہر ہے۔ ویدوں میں خدائے واحد کا تصور موجود ہے لیکن وہ اس کے علاوہ دوسرے دیوتاؤں کی ہستی کو بھی مانتے ہیں۔ شلوک 129. 10 بعنوان "تخلیق" میں مرقوم ہے کہ دیوتاؤں کی تخلیق آفرینش کائنات کے بعد عمل میں آئی۔ تخلیق سے مراد۔ ہستی از نیستی نہیں بلکہ ابدی مادے سے مختلف نوع کے اجسام کی تشکیل ہے۔

یونانی فلسفیوں نے یہی ہندی فلسفہ اپنایا اور ابن رشد نے بھی اسی کی تقلید کی۔ علاوہ ازیں ویدوں میں اعلےٰ و ادنیٰ دیوتاؤں کا تصور ملتا ہے جس پر افلاطون یقین رکھتا تھا۔ انسانی فطرت کا جزو فنا ہوتا ہے وہ ان کمتر دیوتاؤں کی دین ہے۔

۴۔ وحدت الوجودی نقطہ نظر یقیناً ویدک ہے۔ اسے سمجھنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ تمام دیوتا خدائے واحد کا مظہر ہیں اور الوہیت ایک ارتقائی سلسلہ ہے حتیٰ کہ اندر جو ویدوں کے مہا دیوتا ہیں وہ بھی خدا نما ہیں۔ یہ سب اپنے اعمال کی راستی سے خدائے واحد یعنی روح کل سے وصال پاتے ہیں۔

اس مسئلے کی ویدک وضاحت بہت ضروری ہے:

الف۔ خدا کائنات کا ناظم ہے کیونکہ یہ اس کی نگاہ ہے جو اس کی حرکت پر قابو رکھتی ہے (7. 29: 10)

ب۔ اس کے کنٹرول کا طریقہ یہ ہے کہ وہ سنسار کی رگ رگ میں روح واحد کی طرح سرایت کر چکا ہے:

وہ جو ایک ہے وہی اس تمام (سنسار) میں رونما ہے (رگ وید۔ والاخلیا (2. 10: 8

ویدوں کی رو سے تمام سنسار غیر مربوط مادے سے تشکیل ہوا جو رفتہ رفتہ عمل میں آئی (7-1. 129: 10)

*اس سلسلے میں قرآن کی اس آیت پر نگاہ ڈالئے:

"کیا کافروں نے نہیں دیکھا آسمان اور زمین جڑے ہوئے تھے (یعنی مادے کا ایک بے ربط انبار تھا) تو ہم نے انہیں جدا۔ جدا کر دیا (اور اس طرح اس ہیولیٰ سے آسمان اور زمین وجود میں آئے) اور تمام جاندار چیزیں ہم نے پانی سے بنائیں" (الانبیا ۲۱۔ ۳۰)

اس سلسلے میں رگ وید کا یہ شلوک دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

"خدا نے یہ دونوں جہاں (زمین اور آسمان) پانی سے پیدا کئے جو اس میں ڈوبے ہوئے تھے" (1. 82: 10)

۵۔ اصفیا کا نظریہ ہمہ اوست بھی سراسر ویدوں کا محتاج ہے جس کی رو سے وہ ہر چیز کو عارضی اور سراب نظر ٹھہراتے ہیں اور صرف خدا کی اصلیت کو مانتے ہیں:

"وہ (اندر دیوتا یعنی خدا) جس کا یہ سارا جہاں ایک کاپی (نقل یا سایہ) ہے۔ اس (ساکت) جگت کو گرداں* رکھتا ہے" (رگ وید 2:129)

ویدک علما نے دنیا کی اس سرابی نوعیت کو "مایا" کا نام دیا ہے۔ اس سلسلے میں یہ شبد بھی ملاحظہ ہو:

"دنیا کی ہر چیز کا ماڈل (نمونہ تعمیر) اندر (خدا) ہے جو اپنی بے شمار صورتوں کے ذریعے مایا کے روپ میں جلوہ گر ہے" (رگ وید 6:47.18)

اس سلسلے میں یاد رکھنا چاہیئے کہ افلاطون کے اس مشہور زمانہ نظریہ کا منبع یہی ویدک شبد ہے جو IDEAS یا FORMS کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی رو سے ہر چیز کا ایک ابدی ماڈل (ARCHETYPE) موجود ہے جس کی نقل پر دنیا کی ہر چیز بنائی گئی ہے۔

اہل ہند (بلا تخصیص مذہب) کی بے مائیگی کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنے بزرگوں کے کارناموں سے بالکل بے خبر ہو چکے ہیں۔ اہل پاکستان اس میں پیش پیش ہیں۔ انہوں نے اعلان کر دیا ہے کہ تشکیل پاکستان سے پیشتر جو بھی تاریخ ہے اس سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ استغفراللہ۔ جو لوگ اپنے باپ۔ دادا کی شخصیت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ ہوں وہ یقیناً پاگل پن کا شکار ہیں۔ غضب تو یہ ہے کہ رگ وید جس سے میں اقتباسات پیش کر رہا ہوں پنجاب میں تخلیق ہوئے اور یہ اعلان جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے اہل پنجاب سے منسوب ہے۔ ایسے لوگوں کی ذہنی حالت کو جتنا بھی مطعون کیا جائے۔ کم ہے۔

۶۔ انفرادی روح کا روح کل میں ادغام۔ ہمیشہ ہی ہندی اعتقادات کا جزو رہا ہے۔ مشہور ہندی فلسفی شنکر اچاریہ نے اس نقطہ کی تشریح یوں کی ہے کہ اس (ظاہری) دنیا کی اساس برہمن (خدا) ہے۔ آتما (انفرادی روح) اور پرماتما (خدا) جو روح کل ہے۔ اصل میں ایک ہیں۔ جب انفرادی روح مادے یعنی جسم میں قید ہوتی ہے تو اپنی کم نظری کے سبب اپنی یزدانی اصلیت کو دیکھ نہیں پاتی لیکن جب یہ گیان (عقل) کی شکتی (قوت) سے حجابات کا پردہ اٹھا لیتی ہے تو اسے حقیقت دکھائی دینے لگتی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جب آتما اور پرماتما (برہمن یعنی خدا) کا وصال عمل میں آتا ہے۔

اپنشد جو 900 قبل مسیح لکھے گئے انہوں نے آتما اور پرماتما کے وصال کے مسئلہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس سلسلے میں برہاد آرنیکا اپنشد (1.4.7) اور سوتیا سوتر اپنشد (2:15) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

---

* نوٹ کیجئے کہ ارسطو کے مابعد الطبیعاتی نظام میں ہر معلول کے لئے ایک علت یعنی EFFECT کے لئے ایک CAUSE چاہیئے بالفاظ دیگر ہر وجود کا ایک سبب ہے۔ اس جہاں کی بقا کی وجہ حرکت یعنی گردش ہے۔ اس دنیا کو اس نے ایک منظم خدا دینے کے لئے یہ مفروضہ پیش کیا کہ خدا اپنی ذات ہی سے گرداں یعنی SELFMOVER ہے۔ ارسطو کا یہ نظریہ یقیناً اس مندرجہ بالا شبد سے ماخوذ ہے

یہ عقیدہ یونانی اختراع نہیں۔ ہندوستانی فلسفہ کی ایک شاخ ہے جس کی رو سے روح کل کا وصال صرف دانش سے ممکن ہے۔

۔ غضب تو یہ ہے کہ اہل ہند کا اپنی روایات سے اعتماد اس طرح اٹھ چکا ہے کہ انہیں اپنی خوبیاں بھی اغیار کی دین نظر آتی ہیں جو انہوں نے ہندوستانی تہذیب سے اخذ کیں مثلاً کہا جاتا ہے کہ قانون فطرت کو کائنات کی جلوہ گری کا سبب قرار دینا۔ یونانی فلسفہ کا کمال ہے۔ یہ سراسر بذیان ہے کیونکہ قانون فطرت کو سمجھنے اور اس کی تشہیر میں ہندی فلاسفہ کو یکتائی حاصل ہے۔ اس موضوع کی اہمیت اتنی شدید ہے کہ رگ وید میں اس کا کھلے انداز میں کم از کم ایک سو بیس (120) بار ذکر کیا گیا ہے۔

ویدک فلسفہ کے مطابق یہ جہان ایک قانون کا پابند ہے نہ کہ خدا کی آمرانہ مشیت کا۔ تمام دیوتا اس قانون فطرت کے تابع ہیں۔ قانونی تابعداری ان کے دیوتا پن کی ضامن ہے۔ اس قانون کی رضا و محبت سے پابندی کرنا ہی مشیت ایزدی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

۱۔ "اے خدا! نظام عالم کا انحصار تیرے قانون عظمیٰ پر ہے" (رگ وید 1.62:5)

۲۔ "دیوتا قانون کے پابند ہیں جسے اقوام عالم بھی مقدس سمجھتی ہیں" (رگ وید 4.67:5)

۳۔ "دیوتا پابندی قانون ہی سے صداقت سے آگاہ ہوئے۔ قانون کی اطاعت کرنے والے ہی پیدائشی طور پر روشن۔ پاکباز اور مقدس ہوتے ہیں" (رگ وید 12.56: 7)

ظاہر ہے کہ قانون چند بنیادی اصولوں کے مجموعے کو کہتے ہیں جن کی تشکیل کا تعلق عقل سے ہے نہ کہ عشق اور جنون سے۔

یہ جہان جس کی تکوین سراسر اٹل عقلی اصولوں پر مبنی ہے کسی جذباتی احمق کے بس کی بات نہیں۔ علاوہ ازیں اس پر قانون مطلق کی حکومت ہے جس میں ذرہ بھر رد و بدل کی گنجائش نہیں۔ اس حقیقت کے لئے (PHYSICS) سے ایک مثال پیش کرتا ہوں:

برقیوں کی دو اقسام ہیں۔ مثبت اور منفی جو طبعاً ایک دوسرے کے متضاد (OPPOSITE) اور تعداد میں قطعی یکساں ہیں۔ ان بے شمار برقیوں کی وسعت کا اندازہ لگانے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ صرف ایک گرام ہائیڈروجن میں چھ سو بلین ٹرلین پروٹانز (PROTONS) اور بالکل اسی نسبت سے الیکٹرانز (ELECTRONS) ہوتے ہیں۔ ایک اونس مادے کے ان متضاد برقیوں کی تعداد میں اگر ایک فی صد فرق بھی آجائے تو یہ (ایک اونس مادہ) اس شدت سے پھٹے گا جو تمام کرۂ ارض کے وزن کے برابر ہوگا۔

اس مثال میں قانون قدرت کی وضاحت یوں ہے:

الف۔ مادہ برقیوں سے مدون ہے۔

ب۔ برقیوں کے لئے طبعاً متضاد ہونا ضروری ہے

ج۔ ہر اونس مادے میں متضاد برقیوں کا قطعاً مساوی تعداد میں ہونا امر لازم ہے۔
د۔ برقیوں کی تعداد بہت کثیر ہے لیکن اگر اس میں تھوڑی سی تفاوت بھی آجائے تو یہ تباہی کا سرچشمہ ثابت ہوگی۔

ظاہر ہے کہ ان باتوں کا تعلق عقل سے ہے لہذا اس کائنات کی خالق دانش ہے اسی حقیقت کے پیش نظر ہندی روایات نے اس جہان کو عقل کل کی کارکردگی گردانا ہے:

"دیوتاؤں میں جو عقلی قوت موجود ہے وہی ان کے دیوتا پن کی ضامن ہے" (رگ وید 3. 56: 10)

یاد رکھنا چاہیئے کہ میں ویدوں کو ہندوؤں کی مقدس کتابیں نہیں سمجھتا۔ ان کا تعلق۔ بلا تخصیص مذہب۔ برصغیر کے تمام باسیوں سے ہے کیونکہ ان کی تخلیق ہندوستان میں ہندوستانی دانشوروں (رشیوں) نے کی جن کی عالمگیر دانش اور رفعت عمل کا جواب نہیں۔ کوئی مانے یا نہ مانے ہندوستانی تمدن کی بنیاد انہی ویدوں پر ہے اور اسے معاشرتی حقائق کی روشنی میں آسانی سے ثابت کیا جا سکتا ہے۔

اس تحریر کا منشا۔ ویدوں کا پرچار نہیں بلکہ یہ جتانا مقصود ہے کہ برصغیر ہند کی معاشرتی اساس عقل ہے عشق نہیں۔ اقبال کشمیری برہمن تھے اس لئے اپنی جدی روایات کی عقلی نوعیت سے اچھی طرح واقف تھے لیکن اپنے آپ کو قلندر منوانے کیلئے حقیقت سے منحرف ہو کر عشق کی ڈفلی بجانے لگے۔

انہیں اپنی انا کا بڑا زعم تھا۔ یہی وجہ ہے کہ عمر بھر مرزا غلام احمد قادیانی کی مریدی کرنے کے باوجود آخری ایام زندگی میں اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ روحانی مسجد قائم کرنے کے لئے قادیانیت سے برسرپیکار ہو گئے۔ اس میں حکمت یہ تھی کہ مرزا صاحب مندرجہ ذیل آیت کی دور افتادہ تاویل کرتے ہوئے اپنی بروزی نبوت کی دوکان چمکا چکے تھے:

"محمد۔۔۔ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔۔۔" (الاحزاب 40 . 33)

اسلام کی قدیم روایت کو توڑتے ہوئے مرزا صاحب نے دعویٰ کیا کہ محمد عربی آخری نبی نہیں بلکہ نبیوں کی مہر ہیں یعنی ان کے بعد جو نبی آئے گا اس کی بخت پر حضور کی مہر نبوت ثبت ہوگی۔ مرزا صاحب کے اس دعوے پر سخت غوغہ آرائی ہوئی اور مسلمانوں نے ان کے خلاف تحقیر کا ایک شدید طوفان کھڑا کر دیا۔ اگر علامہ اقبال بھی ایسا ہی دعویٰ کرتے تو نہ صرف ان کے خلاف بھی ایک اندوہناک تحریک چلتی بلکہ ان پر کوئی بھی یقین نہ کرتا کیونکہ ایک ہی وقت میں ایک ہی خاندان میں دو نبیوں کا نزول ایک اچنبھے سے کم نہ ہوتا۔ چنانچہ انہوں نے ہوا کا رخ دیکھتے ہوئے قادیانیت سے کنارہ کشی کی اور اپنی قلندری کا دعویٰ کر دیا جس کی بنا تعمیر خودی پر ہے اور تکمیل صرف عشق سے ممکن ہے۔ غضب تو یہ ہے کہ علامہ مرحوم نے نہ تصور خودی کی کوئی جامع تعریف پیش کی اور نہ ہی راز عشق کی حقیقت کو عیاں کر سکے۔

چونکہ میں اس موضوع پر اپنے مقالہ "اقبال اور قلندری" میں مفصل بحث کر چکا ہوں اس لئے یہاں صرف سرسری طور پر ہی ان کی قلندری اور متعلقہ نکات پر گفتگو کروں گا۔ علامہ مرحوم فرماتے ہیں:

فردوس میں رومی سے یہ کہتا تھا سنائی — مشرق میں ابھی تک وہی کاسہ ہے وہی آش

حلّاج کی لیکن یہ روایت ہے کہ آخر　　اک مردِ قلندر نے کیا رازِ خودی فاش

یہ "مردِ قلندر" خود اقبال ہیں جو اپنا مقام اس قدر بلند سمجھتے ہیں کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کو بھی اپنی تقلید کے قابل نہیں سمجھتے۔

نہ کر تقلید اے جبریلِ میرے جذب و مستی کی　　تن آساں عرشیوں کو ذکر تسبیح و طواف اولیٰ

یہاں اقبال کا مقام "جذب و مستی" اہلِ عرش کی حمد ایزدی سے کہیں ارفع ہے۔ جو وہ تسبیح و طواف کی صورت میں کرتے ہیں۔

ان کی "جذب و مست" کی بنا ان کی خودی ہے۔ جو کاملیت کی بلندیوں کو پار کر چکی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ خود خدا ان کی مرضی پوچھ کر ان کی تقدیر لکھتا چاہتا ہے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے　　خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

چنانچہ اس حقیقت کے پیشِ نظر وہ اپنے قلندرانہ فرائض کی ادائیگی کے لئے ہر ایک کو یہ تلقین کرتے ہیں۔

خودی میں ڈوب جا غافل یہ سرِ زندگانی ہے　　نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا

اقبال اپنے دعوئ قلندری کی تکمیل اصول خودی سے کرنا چاہتے ہیں کیونکہ انہیں یقین ہے کہ ان میں غیر معمولی روحانی شرف موجود ہے۔ جو دراصل ایسا نورِ بصیرت ہے کہ اگر یہ نوجوان نسل میں نہ پھیلا تو ان کی دینوی اور دنیاوی زندگی مسدود ہو کر رہ جائے گی۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

جوانوں کو مری آہِ سحر دے　　پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے

خدایا آرزو میری یہی ہے　　مرا نورِ بصیرت عام کر دے

یاد رکھنا چاہیئے کہ قرآن کے مطابق رسول عربی کو بھی اپنے نورِ بصیرت کے متعلق کوئی ایسا دعویٰ نہ تھا۔ وہ صرف "نذیر" یعنی ڈرانے والے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ کسی کو ہدایت بھی نہیں دے سکتے کیونکہ لوگوں کو صراطِ مستقیم دکھانا صرف اللہ تعالےٰ کا کام ہے۔

اقبال کے نزدیک نورِ بصیرت "عقل دشمنی" کا دوسرا نام ہے۔

اہلِ دانش عام ہیں کم یاب میں اہلِ نظر　　کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا ایاغ

"اہلِ دانش" وہ ہیں۔ جو خدا کو عقل کن مان کر عقل و استدلال کی راہ اختیار کرتے ہیں لیکن "اہلِ نظر" وہ ہیں جو عشق کو مشعلِ راہ بناتے ہیں۔ اس مفروضے کے پیشِ نظر عشق کی جامع تعریف امر لازم ہے لیکن ان کے ارشادات سے صاف ظاہر ہے کہ عشق۔ جذباتی بھول بھلیوں کا دوسرا نام ہے۔

کبھی آوارۂ بے خانماں عشق　　کبھی شاہِ شہاں نوشیرواں عشق

کبھی میداں میں آتا ہے زرہ پوش　　کبھی عریاں و بے تیغ و سناں عشق

مزید برآں فرماتے ہیں۔

کبھی تنہائی کوہ و دمن عشق — کبھی سوز و سرور انجمن عشق
کبھی سرمایہ محراب و منبر — کبھی مولا علی خیبر شکن عشق

اقبال اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کا نظریہ عشق بے جان ہے اس لئے کوئی بھی ان کی پیروی کرنے پر مائل نہیں ہو گا چنانچہ وہ اپنی قلندری کے لئے محمد عربی کا وسیلہ ڈھونڈتے ہیں اور جس طرح کشتی میں لگے ہوئے لوہے کے کیل لکڑی کے ساتھ تیرتے ہیں وہ تعظیم محمدی کا انتفاع کرتے ہوئے مسلم عوام کے لئے اپنی ذات کو پر کشش بناتے ہیں۔

"اے روح محمد"

شیرازہ ہوا ملت مرحوم کا ابتر؛ — اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے؛
وہ لذت آشوب نہیں بحر عرب میں — پوشیدہ جو ہے مجھ میں وہ طوفان کدھر جائے؛
ہر چند ہے بے قافلہ و راحلہ و زاد — اس کوہ و بیاباں سے حدی خوان کدھر جائے؛
اس راز کو اب فاش کر اے روح محمد؛ — آیات الٰہی کا نگہبان کدھر جائے؛"

یاد رکھنا چاہیئے کہ قرآن کی نگہبانی کا ذمہ اللہ تعالےٰ نے خود لیا ہے لیکن لوگوں کو جذباتی چکر دینے کے لئے اقبال یہ فریضہ اپنے سر لینا چاہتے ہیں۔

ان کی قلندری کی بنیاد اور آیات الٰہی کی نگہبانی کا راز تقلیب رومی میں مضمر ہے۔

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید — کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون
علاج آتش رومی کے سوز میں ہے ترا — تری خرد پہ ہے غالب دگرگوں کا فسوں
اسی کے فیض سے میری نگاہ ہے روشن — اسی کے فیض سے میرے سبو میں ہے جیحوں

یہ رومی کون ہے جو ضمیر اقبال میں انوار الٰہی کی تجلیاں بکھیر رہا ہے؟

مولانا جلال الدین رومی 1201ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی جنم بھومی بلخ ہے اور وہ شاہ خوارزم کے نواسے تھے۔ اس طرح ان کی رگوں میں شاہی طمطراق کا خون موجزن تھا۔ ان کی ذہنی تربیت پر شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کا گہرا اثر تھا کیونکہ انہوں نے کافی مدت تک صدر الدین قونوی سے تعلیم حاصل کی جو ابن عربی کے شاگرد تھے۔ ابن عربی 1165ء میں وارد دمشق ہوئے اگرچہ وہ دمشق میں سکونت پذیر تھے ان کی پیدائش سپین میں ہوئی۔ ان سب کے مرشد ابو حامد الغزالی تھے جو بمقام طوس 1058 میں پیدا ہوئے۔

اگر میں صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے یہ کہہ دوں کہ یہ صوفیا ان اصولوں کے پابند تھے جن سے اہل ہند ویدوں کی وساطت سے آشنا ہوئے تو قارئین مچل جائیں گے۔ حقیقتاً تصوف کا پرچار جس میں اقبال پیش پیش تھے اسلام کے پردے میں اسلام کے خلاف گھناؤنی سازش ہے کیونکہ مجموعی طور پر ان صوفیوں کے اعتقادات حسب ذیل تھے جو روح اسلام کی ضد ہیں:

۱۔ صوفیوں کے عقیدہ میں یہ کائنات ہمیشہ ہی سے چلی آرہی ہے اور ہمیشہ ہی چلتی رہے گی۔ خدا کی ہستی اپنی جگہ الگ اور بنفسہ ہے۔ وہ خالق نہیں بلکہ ایک انجینئر کی طرح ہے جو مختلف حصوں کو جوڑ کر ایک نئی چیز پیدا کرتا ہے جس کے اجزا پہلے ہی سے موجود ہیں۔ مادہ ابدی ہے۔ یہی ویدک اصول ہے جو اہل یونان نے اپنایا۔

اسلامی نظریہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ خدا خالق ہے۔ صرف وہی ابدی و ازلی ہے۔ باقی ہر چیز اس کی مخلوق ہے۔ مادہ تخلیق کیا گیا ہے اور زوال پذیر ہے۔

۲۔ اصفیا کی لغت عقیدہ میں خدا عالمی روح ہے اور انسانی روح اس کا ایک جزو ہے جو کل سے ملاپ کے لئے بیتاب ہے۔ لہذا انسانی زندگی کا مقصد وصال الہیٰ ہے۔ یہی ویدک عقیدہ ہے جس کی وضاحت آج سے تقریباً تین ہزار برس اپنشدوں میں کی گئی۔

اصول اسلام اس کے برعکس ہے۔ روز محشر کو انسان دوبارہ زندہ کئے جائیں گے۔ جو اہل ایمان ہیں انہیں محشر کے دن جنت میں داخل کیا جائے گا جہاں وہ حور و غلمان کے ساتھ رنگ رلیاں منائیں گے لیکن منکرین نار جہنم کی نذر کئے جائیں گے۔

۳۔ صوفیوں کے عقیدہ کے مطابق نجات۔ مکتی یا نردان کا انحصار ذاتی عمل و ریاضت پر ہے لیکن اسلام میں اس کا مدار نبوت محمدی پر ایمان لانے میں ہے۔ صرف عمل بے معنی ہے یہ اور بات ہے کہ اس اصول میں کئی تبدیلیاں پیدا کی جا چکی ہیں جن کی اصل وجہ اصفیا کی انا پرستی ہے۔ اس سلسلے میں اختصاراً عرض ہے کہ:

الف۔ صوفی ازم اسلام کے نام پر اسلام کے خلاف ہی ایک متوازی "روحانی" نظام ہے۔ ابن عربی کی تعلیمات کے مطابق ایک ولی کا درجہ نبی سے برتر ہے کیونکہ اول الذکر براہ راست خدا سے علم حاصل کرتا ہے لیکن موخر الذکر ایک فرشتے (جبرائیل) کی وساطت کا محتاج ہے۔ ولیت کی نبوت پر فضیلت کا دوسرا سبب یہ ہے کہ قانون الہیٰ کا مشتہر ہونے کی رو سے نبی کا تعلق انسانوں سے ہے لیکن ولی کا واسطہ براہ راست خدا سے ہے۔

استغفر اللہ۔۔۔ کیا یہ اسلام ہے؟ کیا واقعی اصفیا کرام نے کروڑوں ہندوؤں کو مشرف بہ اسلام کیا؟ کہتے ہیں "لہو لگا کر شہیدوں میں نام پیدا کر"۔۔۔ ان لوگوں نے اسلام کا لبادہ پہن کر مقبولیت محمد کا انتفاع کیا۔ چونکہ نبوت کے دروازے بند ہو چکے تھے۔ ان "ولیوں" میں اتنا دم نہ تھا کہ دعویٰ رسالت کر سکتے چنانچہ انہوں نے اپنے شرف کا سکہ جمانے کے لئے اسلام کے پردے میں تصوف کی راہ اختیار کی۔

ب۔ اقبال اور ان کے پیش روؤں کا نظریہ عشق اسی حکمت عملی کی پیداوار ہے۔ عشق کیا ہے؟ یہ محبوب (جو انسان کے علاوہ مال و زر۔ رتبہ۔ حصول قوت وغیرہ بھی ہو سکتا ہے) سے ایسی لگن ہے جو عاشق میں وارفتگی اور دیوانہ پن پیدا کر دیتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معشوق۔ عاشق کی منزل مقصود بن جاتا ہے جس کے بغیر اسے کچھ اور سوجھتا ہی نہیں۔ اس طرح وہ ہر چیز کو جذبات کی عینک سے دیکھنے لگتا ہے۔ جزا و سزا کے معروضی معیار بے کار ہو جاتے ہیں۔ نیک اور پر لطف وہی ہے جو حصول محبوب کے قریب لے جائے خواہ وہ در حقیقت برائی اور عذاب کی جڑ ہی کیوں نہ ہو۔ یہ وہ کیفیت ہے جس میں عقل

ماؤف ہو جاتی ہے اور اس کا انتشار جلوہ افروزی کے بجائے ظلمت گری کا کردار ادا کرنے لگتا ہے۔ غالب نے شاید اسی سلسلے میں کہا تھا۔

نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

صوفی حضرات نے اپنے پرچار میں نظریہ عشق کو اس لئے ہوا دی کہ لوگ عقل کے بجائے جذبات پر انحصار کرنا شروع کر دیں اور عشق یعنی جنون و دیوانگی کی بھول بھلیوں میں اس طرح کھو جائیں کہ انہیں عقل، شرع اور عشق، خیر دکھائی دینے لگے۔ عیاری کی انتہا یہ ہے کہ انھوں نے اپنے اس اسلام شکن مسلک کا سربراہ محمد مصطفیٰؐ کو قرار دیتے ہوئے خود کو ان تک قرب حاصل کرنے کا ایک وسیلہ ظاہر کیا۔ یہ ایک بڑی نفسیاتی چال تھی۔ جس طرح ایک بنیا یا سودی اصل زر سے بیاج کو زیادہ پیار کرتا ہے۔ اسی طرح جو لوگ دام تصوف میں پھنس جائیں انہیں اپنے پیر و مرشد کے علاوہ اور کچھ دکھائی نہیں دیتا اور وہ قرآن و حدیث اور مقام نبوت کو بھول جاتے ہیں۔۔۔ یہ دراصل مسیحی نقطہ نظر لوگوز (LOGOS) کی توسیع ہے جو یونانی فلاسفہ سے ماخوذ ہے۔ منصور حلاج نے لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کے لئے مقام محمدی کو "ھو۔ ھو" کہہ کر پکارا اور اقبال نے اپنی قلندری جمانے کے لئے "عشق محمدی" کا ترانہ چھیڑا لیکن دیار حبیب پر حاضری نہ دے سکے۔ یہ ان کے عشق محمدی کی حقیقت ہے!

۴۔ نظریہ وحدت الوجود بھی اصفیا کی ایک غیر اسلامی اختراع ہے جو ویدوں سے ماخوذ ہے۔ درحقیقت یہ اس اصول کی کاربن کاپی ہے جس کی اپنشدوں میں برہما (دیوتا) کے نام سے تشریح کی گئی ہے۔

اسلامی نقطہ نظر سے اللہ خالق ہے جس کا وجود حقیقی اور بذات ہے۔ یہ جہان اس سے الگ ہے اور فانی ہے۔

۵۔ اصفیا کی نگاہ میں یہ جہان محض نظر کا دھوکہ ہے جسے ویدوں نے "مایا" کا نام دیا ہے لیکن اسلامی زبان میں یہ مخلوق ہونے کے سبب وجود کا حامل ہے جو اس وقت تک برقرار ہے گا جب تک اس کی بربادی کا وقت نہیں آتا۔

یہ جو کچھ میں نے اوپر کہا ہے مولانا روم کی صوفیانہ شاعری کا حصہ ہے۔ جو بقول اقبال۔

علاج آتش رومی کے سوز میں ہے ترا
تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں
اسی کے فیض سے میری نگاہ ہے روشن
اسی کے فیض سے میرے سبو میں ہے جیحوں

اقبال خود کو "مرید رومی" کہتے تھے لیکن یوں معلوم ہوتا ہے جیسے پیر رومی کے افکار اگرچہ سراسر ویدک ہیں لیکن انھوں نے یہ ویدوں کے براہ راست مطالعہ سے نہیں بلکہ "امام" "غزالی" کی نگارشات سے اخذ کئے ہیں جو فلاطینوس سے متاثر تھے۔

فلاطینوس (PLOTINUS) تیسری صدی عیسوی کے عظیم فلسفی اور مذہبی راہنما تھے۔ ان کے افکار ستارھویں صدی یورپ اور ایشیا کے دانشوروں اور دینی پیشواؤں کو بھی متاثر کرتے رہے۔ وہ مصر میں ضرور رہتے تھے لیکن ان کی

قومیت سے کوئی بھی آگاہ نہیں ہے۔ یہ ان کی ادراک و فراست تھی جس نے افلاطونی فلسفہ کو ترویج و دوام بخشا۔

انسائیکلو پیڈیا۔ بری ٹانیکا کے پندرھویں ایڈیشن۔ جلد چودہ کے صفحہ 573 پر مرقوم ہے کہ "فلاطینوس کے افکار کو ہندوستان کے مذہبی فلسفہ سے گہری مماثلت ہے" یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے اجاگر کرنے کے لئے میں نے ویدوں سے براہ راست حوالے دیئے ہیں جو شائقین علم چیک کر سکتے ہیں۔ اس مشق کا مقصد ویدوں کا پرچار نہیں بلکہ ہندی نژاد ہونے کے ناطے سے برصغیر کے لوگوں کو یہ یاد کرانا مقصود ہے کہ ان کا دیس پسماندگی کا نہیں بلکہ تہذیب انسانی کا گہوارہ ہے۔ کاش کہ وہ کبھی اس حقیقت کا سراغ لگانے کی خود بھی کوشش کریں تاکہ ان کے سر فخر سے اوپر اٹھ سکیں۔

فلاطینوس کا فلسفہ پیچیدہ ہے لیکن اسے اختصار کے طور پر یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

الف۔ احد (خدا) فلاح (GOOD) ہے۔ نہ اس کا تصور کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اسے الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ وہ قطعی طور پر ایک اور غیر محدود ہے اور تمام مرئی اور غیر مرئی حقائق کا منبع ہے۔

ب۔ عقل یا روح خدائے مطلق کی پہلی تخلیق ہے جو خود اس سے ماخوذ ہے۔ بالفاظ دیگر خدا کل یا عالمی روح ہے اور انسانی عقل یا روح اس کا جزو ہے۔

ج۔ یہ جہان ہمیشہ سے قائم ہے اور رہے گا یعنی کائنات ابدی و ازلی ہے۔ وقت روح عالم کی حیات ہے جو سنسار میں رواں۔ دواں ہے۔

د۔ وجود یعنی ہونے کی مختلف سطحیں ہیں۔ اگرچہ ہر وجود کے درجات (ایک دوسرے سے) متمیز ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے الگ نہیں بلکہ ہر جگہ اور ہر چیز میں جڑے ہوئے ہیں۔

ہ۔ روحانی سطح سے اتر کر مقام عقل حاصل کرنا اور اس سے بلند تر ہو کر وصال ایزدی کا حصول۔ حالت سفر سے مماثلت نہیں رکھتا بلکہ شعوری ارتقا کا ایک نیا تجربہ ہے۔

ز۔ انسانی زندگی کا مقصد احد (خدائے مطلق) سے وصال ہے اور اس کا ذریعہ عقل اور اعلےٰ اخلاق ہے۔

یہ فلاطینوسی اصول مولانا روم کی شاعری میں سما گئے اور ان کے ساحرانہ انداز بیان کی وجہ سے اسلام کے صوفی حلقہ کی روح رواں بن گئے۔ مولانا روم نے نہ صرف ان ویدک اصولوں کو اپنایا بلکہ رقص اور گیت کو بھی اپنے درویشوں کے مسلک میں شامل کر لیا جو ویدک دیوتاؤں کی پہچان ہے:

"او۔ اندرا (دیوتا) تو جو بڑا رقاص ہے اکثر لوگ تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں" (رگ وید 9. 24: 8)

رقص اور گیت ویدک عبادت کے اجزا ہیں جسے اہل تصوف نے اپنا مان لیا لیکن یہ سب اسلام میں سراسر حرام ہیں۔ قرآن۔ حدیث یا سنت نبوی میں کہیں بھی نہیں آتا کہ حضور نے کبھی ناچ۔ گانے کو صوم و صلوۃ کا انگ قرار دیا ہو۔ ترمذی شریف۔ جلد دوم میں تفسیر سورہ لقمان کے سلسلہ میں گانے بجانے کو "النفاق قیۃ النزنا" کہا گیا ہے یعنی گانا زنا کا منتر ہے۔ یہی وجہ کہ اور تہذیبی دور سلطنت میں گانا اور ناچنا غیر اسلامی شعائر میں شمار ہوتے تھے۔

اقبال نے مولانا روم کے نظریہ عشق کو ایسی آتش کہا ہے جس کے سوز میں قلب و نظر کا علاج پوشیدہ ہے اور جس کے فیض نے انہیں نگاہ روشن عطا کی تھی۔ میں انسائیکلوپیڈیا برٹیانیکا۔ ایڈیشن پندرہ۔ جلد دہم صفحہ 14 سے ایک اقتباس پیش کرتا ہوں جس سے مولانا روم اور ان کے ساتھی صوفیوں کے عشق کی حقیقت واضح ہوتی ہے:

"تیس نومبر 1244 جلال الدین رومی کی زندگی میں ایک انقلاب انگیز دن تھا جب کہ وہ کونیا کی گلیوں میں ایک خانہ بدوش درویش شمس طبریز نامی سے ملے۔ شمس الدین کا نام کسی صوفی سلسلہ کے ساتھ نہیں جوڑا جا سکتا۔ وہ دونوں ایسی قربت سے رہنے لگے کہ لوگوں نے ان کے چلن پر انگلیاں اٹھانا شروع کر دیں۔ یہ سلسلہ کئی مہینوں تک جاری رہا اور جلال الدین نے اپنے مریدوں اور اہل خانہ کو بھی نظر انداز کر دیا۔ اس کی تاب نہ لاتے ہوئے ان کے مریدوں اور گھر والوں نے فروری 1246 میں شمس طبریز کو زبردستی شہر سے باہر نکال دیا۔ جلال الدین رومی اس قدر دل شکستہ ہو گئے کہ ان کے بڑے بیٹے سلطان ولد۔ شمس طبریز کو شام (SYRIA) سے ڈھونڈ کر واپس لے آئے لیکن جلال الدین رومی کے گھر والے اس تعلق کو برداشت نہ کر سکے جو ان کا اپنے "محبوب" (شمس طبریز) کے ساتھ تھا۔ 1247 کی ایک شب طبریز ہمیشہ کے لئے غائب ہو گیا۔ حال ہی میں تحقیق سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ طبریز کو قتل کیا گیا اور جلال الدین رومی کے بیٹوں کو اس بات کا علم تھا جنہوں نے دراصل طبریز کی لاش کو ٹھکانے لگانے کے لئے اسے ایک کنوئیں کے نزدیک چپکے سے دفن کر دیا جس کے آثار ابھی تک باقی ہیں"۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ تصوف میں "مجازی محبوب" کا تصور شروع ہی سے شدت کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ جس سے مراد یہ ہے کہ صوفی ایک ہمجنس کے عشق میں "محبوب حقیقی" (خدا) کے وصال کی تلاش کرتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں ان کی شاعری جسے "عارفانہ" کلام کہتے ہیں۔ نہ صرف شہوانیت کا ایک غیر معمولی نمونہ ہوتا ہے بلکہ ان کا محبوب۔ جس کی فرقت میں یہ آہیں بھرتے ہیں وہ بھی مذکر ہوتا ہے، اس کی ایک وجہ تو حکیم سقراط ہے جو صوفیوں کا ماڈل سمجھا جاتا ہے جس کا ALCIBIADES یعنی ایک جواں سال لڑکے کے ساتھ معاشقہ تھا اور جسے ایتھنز کے لونڈوں کو ورغلانے کے الزام میں موت کے گھاٹ اتار گیا اور دوسرے یہ کہ قرآن میں غلمانوں یعنی جواں سال لونڈوں کا ذکر ہے۔ جو نہ صرف جواہرات کی طرح خوبرو اور خوش پوش ہیں بلکہ ان پر وقت گزرنے کا بھی کوئی اثر نہیں ہوتا یعنی وہ ہمیشہ ہی خمار شباب سے سرشار رہتے ہیں۔ صوفی خیال کے مطابق ان کی جو تاویل ہے اسے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کا حسن دل فریب۔ عشق کا متقاضی ہے۔

طبریز۔ جلال الدین کا مجازی محبوب تھا۔ لوگوں کی چہ میگوئیاں۔ اہل خانہ کی شرمندگی اور اس کے قتل میں رومی کے بیٹوں کا ملوث ہونا قاری کے ذہن میں گھناؤنی کیفیت پیدا کرتا ہے یاد رہے کہ اس واقعہ سے پہلے مولانا روم شاعر نہیں تھے۔ طبریز کے قتل نے ان کی خفتہ قوت شاعری کو بیدار کر دیا تاکہ وہ غم جاناں کی لہروں کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے نکال کر ساحل لب تک لا سکیں اور اس طرح ان کی طغیانی جذبات میں کچھ کمی واقعہ ہو۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مولانا روم کی اکثر شاعری ان کے غیر اسلامی طرز حیات کی پیداوار ہے وہ اس لئے کہ وہ

میوزک کا سہارا لئے بغیر شعر گوئی نہیں کر سکتے تھے۔

قتل طبریز کے چند سالوں بعد مولانا روم صلاح الدین زرکوب کے عشق میں مبتلا ہو گئے جو کہ ایک گنوار سنار تھا۔ اس معاشقے نے ان کی رگ شاعری کو اور بھی پھڑکا دیا۔ صلاح الدین کی موت کے بعد وہ حسام الدین چلبی کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔ مولانا روم نے عطار اور سنائی کا اسلوب شاعری حسام الدین کو خوش کرنے کے لئے اپنایا تھا۔ ان کی مثنوی کے چھبیس ہزار اشعار اسی محبت نوازی کا نتیجہ ہیں۔

مولانا روم کی مثنوی سے نہ رسول عربی کا وقار ٹپکتا ہے نہ اخلاقی عظمت۔ نہ ہی ان کے اشعار میں اسلام کے مجاہدانہ کردار کی جھلکیاں ہیں اور نہ ہی ملت اسلامیہ کے لئے تعمیر نو کا کوئی پیغام یا نسخہ ہے سچ تو یہ ہے کہ رومی کے کلام میں نہ وہ آتش ہے اور نہ وہ سوز جس سے بیمار مسلمانی کا علاج ہو سکے۔ یہ محض اقبال کا زور خطابت ہے اور ان کی عقیدت مندی کی بنا بھی خلوص پر نہیں بلکہ دنیاداری پر ہے۔ مولانا روم نے ایک نئے فرقہ درویشیہ کی بنیاد ڈالی تھی جس میں رقص و موسیقی کو ایک خاص مقام حاصل ہے جس کی وجہ سے انہیں تمام ایسے ممالک میں پذیرائی حاصل ہوئی جہاں فارسی زبان عروج پر تھی۔ ترکی میں ان کی عظمت کا سبب یہی تھا۔ اقبال انتفاع رومی کی خاطر ان کے مرید بن بیٹھے ورنہ حقیقتاً رومی کا کلام فلاطینوسی یعنی ویدک اصولوں کا علمبردار ہے جو اسلامی تعلیمات کے منافی ہیں۔ اس لئے اقبال کی فارسی شعر گوئی کا سبب تلاش شہرت کے سوا کچھ نہیں۔

اقبال مرید رومی تھے لیکن رومی کے بیک گراؤنڈ میں الغزالی تشریف فرما ہیں اس لئے اس تمام گورکھ دھندے کو سمجھنے کے لئے ابو حامد الغزالی سے کچھ آشنائی ضروری ہے:

الغزالی 1058 میں بمقام طوس پیدا ہوئے۔ ان کے والد بچپن ہی میں فوت ہو گئے تو ایک صوفی دوست نے ان کی پرورش کی۔ ان کے مضامین مطالعہ میں قانون۔ الہیات اور فلسفہ شامل تھے۔ انہوں نے اپنی سوانح حیات میں اقرار کیا ہے کہ عقلی تضادوں کے سبب ان کا اللہ اور دین مصطفوی سے عقیدہ اٹھ گیا۔ یہ نتیجہ تھا ان کی طویل بیماری کا۔ اپنی طبیعت میں ایک بڑا خلا محسوس کرتے ہوئے انہوں نے تصوف کے مجذوبی تصورات میں پناہ ڈھونڈی اور اس طرح خارجی دنیا کے مشاہدات سے منہ موڑ کر کیفیات قلبی میں محو ہو گئے۔ اس عمل میں انہیں احساس ہوا کہ خدا ایک غیر مرئی حقیقت ہے جس کی اساس روحانیت پر ہے۔ حواس خمسہ تلاش حقیقت کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہیں اور عقل جو حواس خمسہ کی ہی توسیع ہے راہنمائی کا کام نہیں دے سکتی۔ انسان میں خدا کو پانے کا وجدانی جوہر (INTUITIVE ABILITY) موجود ہے جو جبلی مشعل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسے ریاضت و مجاہدہ سے جمال حقیقی تک پہنچا سکتا ہے۔ عقل محض ایک علت ہے جو توجیہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ اس میں نہ کوئی تخلیقی قوت ہے نہ راہنمائی کا جوہر۔ اس کا تعلق محض ترتیب سے ہے جیسے گنتی میں ایک کے بعد دو اور دو کے بعد تین کی خود بخود تکرار ہوتی ہے۔ لہذا منطق۔ استدلال اور سائنس بے معنی باتیں ہیں جو خدا اور روح کی ابدی حقیقت کو ثابت نہیں کر سکتیں۔ ان کا عرفان صرف وجدانی کیفیت پر منحصر ہے جو تصوف کی

جان ہے۔

عقلی بیزاری کا پہلا اعلانیہ مبلغ الغزالی تھا جس نے تصوف کو جو دراصل ویدک تعلیمات کا خلاصہ ہے۔ جان اسلام قرار دیا ۔اس میں کوئی شک نہیں کہ الغزالی قرآن و حدیث کے بھی قائل تھے لیکن یہ محض رائے عامہ کو اپنی طرف کھینچنے کا ایک ڈھنگ تھا اور اس کی نوعیت ایک دانے سے مختلف نہ تھی جو ایک چالاک شکاری پرندے کو پھانسنے کے لئے ڈالتا ہے۔ تصوف۔ اسلام کے خلاف ایک متوازی روحانی نظام ہے جس کی تائید ہر اس شخص نے کی جو درجہ نبوی کا خواہشمند تھا لیکن دعویٰ رسالت کرنے کی جرات نہیں رکھتا تھا۔ جب غزالی نے اس کی بنیاد ڈال دی تو اس گلستان میں طرح طرح کے گل ہائے روحانیت کھلنے لگے ۔ان خود ساختہ ولیوں۔ قطبوں اور قلندروں نے اپنے ایمان کا ڈھنڈورا پیٹنے کیلئے محمد عربی کی شان کو اس طرح بڑھا چڑھا کر بیان کیا کہ وہ اپنے دعویٰ عبدیت کے باوجود خدا تو کیا خدا سے بھی بڑھ کر نظر آنے لگے اور اس طرح ان انا پرستوں نے اسلام کی پیش کردہ شان وحدہ لاشریک کا گلا گھونٹ دیا۔

محی الدین ابن عربی (1165 - 1240) نے نہ صرف ویدک عقیدہ وحدت الوجود "اسلامی تصوف" کا ایک جزو لاینفک بنا دیا بلکہ محبوب مجازی کا تصور بھی انہی کی ایجاد ہے جس کی رو سے ایک صوفی کو اس لونڈے یا لونڈیا میں محبوب حقیقی (خدا) کی جھلک دکھائی دینے لگتی ہے جس کے فراق میں وہ آہیں بھرتا ہو لیکن منافقت کی انتہا یہ ہے کہ صوفی عاشق۔ محبوب مجازی سے وصال کا (ظاہری طور پر) منکر اور افلاطونی محبت (PLATONIC LOVE) کا قائل ہے۔ ابن عربی کے اصول کے مطابق "وہ جو عشق (مجازی) میں مبتلا ہو لیکن مرتے دم تک جنسی لذت کا ارتکاب نہ کرے شہید کا درجہ پاتا ہے اور عرفان الٰہی کی انتہائی بلندیوں کو چھوتا ہے"

یہ مجذوب کی بڑ کے سوا کچھ نہیں۔ صوفیانہ شاعری سے بڑی فحاشی اور کوئی نہیں۔ خود ابن عربی جو دوران حج میں ایک معصوم لڑکی کے عشق میں گرفتار ہو گئے اور ساری عمر پیچ و تاب کھا۔ کھا کر شہوانی شاعری کا ارتکاب کرتے رہے۔ اسلامی شعائر کے علمبردار نہیں کہلا سکتے۔ دین محمدی میں حجاب کا ایک بڑا مقصد یہی ہے کہ دوسروں کی بہنوں۔ بیٹیوں کو بھیڑیوں کی نظر بد سے بچایا جائے لیکن ایک صوفی کا ذہن۔ معشوق مجازی کی گرمیوں کے باعث ایک زندہ قحبہ خانہ بن جاتا ہے۔

اقبال کو ابن عربی کا نظریہ عشق۔ جلال الدین رومی کی وساطت سے ورثے میں ملا۔ اس کی بنیاد اسلامی تعلیمات پر نہیں بلکہ ارسطو کے تصور علت پر ہے جس سے مراد یہ ہے کہ ہر معلول کی ایک علت ہوتی ہے اور اسطرح ہر چیز اپنی وجہ تکوین سے عشق کرتی ہے جیسے مخلوق کو اپنے خالق سے اس لئے عشق ہے کہ وہ اس کی وجہ تخلیق ہے۔ اس لئے عشق نہ صرف کائنات کا منبع ہے بلکہ صحیح طریقت اور معشوق حقیقی سے وصال کی ضمانت بھی یہی ہے لیکن اس کے برعکس عقل ناقص اور گمراہی کا سرچشمہ ہے۔

علت و معلول کی بحث طوالت طلب ہے اس لئے اس مختصر مقالے میں اس کی گنجائش نہیں البتہ یہ کہنا ضروری ہے کہ راز تخلیق عشق میں نہیں جو بے آہنگی۔ یک طرفہ جھکاؤ اور جذباتی طغیانی کا دوسرا نام ہے۔ عناصر کا باہمی توازن جو عقل کا خاصہ

ہے اور جس میں جذبات پرستی کو کوئی دخل حاصل نہیں۔ سز آفرینش کی جڑ ہے۔ ذرات کی جذب باہمی کو عشق کہنا غلط ہے۔ یہ عقلی توازن ہے جو ذرات میں ایک غیر جانبدارانہ قانون کی مخلصانہ اور شدید پابندی سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر منفی اور مثبت برقیوں کے تناؤ میں رتی بھر ڈھیل یا جھکاؤ پیدا ہو جائے جو علامت عشق ہے تو کائنات پل بھر میں درہم برہم ہو جائے۔

یہ کائنات۔ اٹل اصولوں کی انتہائی بندش کی پیداوار ہے جس کا تعلق عقل سے ہے جو دو اور دو کو ہمیشہ ہی چار گنتی ہے لیکن عشق میں ایسی حقیقت کیلئے جگہ ہی نہیں۔ جو چیز خدا کو خدا بناتی ہے وہ عقل ہی تو ہے۔ کوئی بے عقل تخلیق کیسے کرے گا جس کے لئے انتہائی حکیمانہ فارمولوں کی ضرورت ہے۔ اتنا ہی نہیں۔ عقل کے بغیر کاروبار ہستی چلانا بھی تو ناممکن ہے۔ عشق جو عقل کی ضد ہے۔ جذبات پرستی اور بے اصولی کا دوسرا نام اور ابری اور نیستی کا پیغامبر ہے۔

یہ بڑے صوفی۔ انا پرست نیم فلسفی تھے۔ ان میں اتنی قابلیت ہی نہیں تھی کہ وہ مظاہر فطرت کی باطنی گہرائیوں کو سمجھ سکیں۔ وہ متکلمین تھے جن کا مقصد ہی عقل کو آلہ کار بنانا اور اپنے منفی نظریات پر جادوئے اثبات کا ملمع چڑھانا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے عاشقی کا لبادہ اوڑھ کر اپنی کوتاہ نظری کو چھپانے کی کوشش کی۔ یہ لوگ چرب زبانی سے اپنے لئے ولیت کا اعلےٰ مقام پیدا کرنے میں تو کامیاب ہو گئے لیکن انہوں نے ملت اسلامیہ کی آنکھوں پر بے عقلی کی پٹی باندھ کر اسے پستی کے گڑھے میں دھکیل دیا جو ہر قدم اٹھنے سے عمیق تر ہوتا جاتا ہے لیکن چلنے والا یوں سمجھتا ہے کہ وہ بلندیوں کی طرف بڑھ رہا ہو۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے عقل سلیم کی ضرورت ہے جو صوفی کے دام عشق میں گرفتار ہو کر اپنی قوت پرواز کھو چکی ہے۔

علم۔ عقل کا اعجاز اور انسان کیلئے سب سے بڑی دین ہے۔ عربوں کو جو رفعت ملی وہ اس فراست کا نتیجہ تھا جو انہیں قرآن نے بخشی۔ یورپ کی ریفرمیشن جس نے رفتہ رفتہ اقوام عالم کی تہذیبی کیفیت بدل ڈالی اور انسان کو چاند اور ستاروں کی سیر کرائی۔ سب عقل دوستی کا نتیجہ ہے۔

جہاں عقل کی فرماں روائی ہو گی وہاں علم ہو گا۔ ہم اہل مشرق ٹکے ٹکے کی باتوں سے لاکھ میاں مٹھو بن کر اپنی پستی اور ضلالت کو عشق کی سنہری اوڑھنی میں چھپانے کی کوشش کریں لیکن کبھی ایسا نہیں کر سکتے کیونکہ عقل دشمن ایک ایسا کلنک کا ٹیکہ ہے جس پر جتنا پردہ ڈالو اس کی تاریکی اتنی ہی زیادہ عیاں ہوتی ہے۔

اقبال نے اپنی عقل دشمنی کا علم گاڑنے کے لئے علم کی تضحیک اور عشق کی تبلیغ کی۔ یہ اسلامی نقطہ نظر سے بدترین گناہ اور قومی لحاظ سے ایک ناقابل معافی جرم ہے۔ آئیے اقبال کے اس پہلو پر نگاہ ڈالیں۔

سب سے پہلے یہ عرض کر دوں کہ کبھی وہ زمانہ تھا جب انہیں تحصیل علم سے دلی لگاؤ تھا؎

زندگی میری ہو پروانے کی صورت یارب
علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یارب
چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے
شراب علم کی لذت کشاں۔ کشاں مجھ کو

لیکن بعد میں انا پرستی کے تقاضوں سے ان کا نظریہ بدل گیا اور انہوں نے غزالی۔ ابن عربی اور بالخصوص رومی کی تقلید میں عشق کا راگ چھیڑتے ہوئے علم و عقل کی دھجیاں اڑانا شروع کر دیں۔

ہے تجھے واسطہ مظاہر سے اور باطن سے آشنا ہوں میں
علم تجھ سے تو معرفت مجھکو تو خدا جو خدا نما ہوں میں

ہے ابد کے نسخہ دیرینہ کی تمہید عشق
عقل انسانی ہے فانی۔ زندہ و جاوید عشق
بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی
عشق فرمودہ قاصد سے سبک گام عمل
عقل سمجھی ہی نہیں معنی پیغام ابھی
عقل گو آستاں سے دور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں
گزر عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے
عقل بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں
راہبر ظن و تخمیں تو زبوں کار حیات
زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعل راہ
کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحب ادراک
علم میں بھی سرور ہے لیکن
یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں

کلام اقبال میں اس طرح کے بیسیوں اشعار ہیں لیکن اختصار کی خاطر اتنا نمونہ ہی کافی ہے۔ غضب تو یہ ہے کہ اقبال نے بھی دیگر اصفیا کی طرح شانہ نبوی پر ہی رکھ کر اپنے غیر نبوی افکار کی بندوق چلائی ہے۔

قوت عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسم محمد سے اجالا کر دے

کیا اقبال کا تصور علم و عقل اسلامی ہے؟ آیئے دیکھتے ہیں اس سلسلے میں قرآن و حدیث کا کیا ارشاد ہے:
سب سے پہلے یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ اسلام میں نظریہ عشق کا جواز تو موجود ہے لیکن اس میں "عشق مجازی" جیسی بدعت کو کوئی دخل حاصل نہیں۔ اسلامی عشق ہے نام پابندی احکام الٰہی کا۔ دینی اعتبار سے وہی عاشق ہے جو صوم و صلوٰۃ کا پابند ہو۔

راہ حق میں سر کٹانے کیلئے ہر وقت تیار ہو۔ رزق حلال کماتا ہو۔ تابعدار اولاد اور شفیق باپ اور ماں ہو اور اپنی نسل کو بہبودی انسان کیلئے پالتا ہو۔

ان باتوں کیلئے عقل اور علم کی اشد ضرورت ہے کیونکہ عقل ہی حیوان کو انسان بناتی ہے اور عقل پر ہی خیر و شر کی پہچان اور اخلاقی اقدار کا انحصار ہے جس میں عقل و علم نہ ہو خواہ وہ کتنا بڑا عاشق کیوں نہ ہو گدھا کہلانے کا مستحق ہے۔ دراصل عشق اور انسانی پستی میں چولی۔ دامن کا ساتھ ہے کیونکہ عقل سے تہی دستی انسانی عظمت کیلئے ضرب کاری ہے۔ غالبؔ مرحوم نے کیا خوب کہا ہے؎

کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

عشق ایک ذہنی بیماری ہے۔ اسلام اس کا علاج علم و عقل تجویز کرتا ہے اور الہام کا اصل منشا یہی ہے۔ پہلی وحی جو حضور پر نازل ہوئی اس میں جبرائیل یہ کلام الٰہی لاتے ہیں:

"خدا انسان کو وہ باتیں سکھاتا ہے جن کا ان کو علم نہیں" (علق 96:5)

قرآن کا دعویٰ علم رسانی ہے جو خیر و شر کی پہچان پیدا کرتا ہے۔ تبلیغ عشق نہیں جو مجذوبیت کا منبع ہونے کے باعث اقدار انسانی کا دشمن ہے۔ اگر ان مندرجہ ذیل احادیث پر نظر ڈالی جائے تو فضیلت علم خود بخود سمجھ میں آجاتی ہے:

"جو شخص راہ علم کی طلب میں چلتا ہے۔ اس کا ہر قدم جنت کی طرف اٹھتا ہے"۔ (ترمذی۔ جلد دوم۔ باب طلب علم)

"جس نے علم طلب کیا۔ اس کے اگلے گناہوں کا کفارہ ہو گیا" (ترمذی۔ جلد دوم)

"عالم کو عابد پر ایسی ہی فضیلت حاصل ہے جس طرح چودھویں رات کے چاند کو ستاروں پر۔ بلاشک علما انبیا کے وارث ہیں" (مشکوٰۃ۔ جلد اول۔ کتاب العلم۔ فصل اول)

"ایک فقیہ۔ شیطان پر ہزار عابدوں سے بھی بھاری ہے" (ترمذی۔ ابن ماجہ)

لیکن حضرت اقبال فرماتے ہیں؎

قلندر جز دو حرف لا الہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہ شہر قاروں ہے لغت ہائے مجازی کا

استغفر اللہ۔ اقبال کون سے اسلام کے پرچارک ہیں۔۔۔ اگرچہ علم دوست احادیث فراوانی سے میسر ہیں۔ میں نمونے کے طور پر صرف چند ایک ہی پیش کروں گا:

حضور نے فرمایا "مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا"

"تمام انبیا معلم انسانیت بن کر آئے اور انسانوں کو مختلف علوم و فنون کی تعلیم دی"

"عالم کی باتیں سننا اور انہیں ذہن نشین کرنا ایک سو غلاموں کو آزاد کرنے سے بہتر ہے"

اس سلسلے میں حضرت علی کا قول بھی کیا خوب ہے:

"جس نے مجھے ایک لفظ بھی پڑھایا۔ سکھایا وہ میرا آقا ہے۔ اسے حق حاصل ہے کہ مجھے منڈی میں لے جا کر فروخت کر دے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں"۔

حقیقت یہ ہے کہ اقبال نے رومی کے اتباع میں تبلیغ عشق سے عقل کشی کی جو بنیاد رکھی وہ مسلمانان ہند کی قومی یکجہتی کے لئے زہر ہلال ثابت ہوئی۔ تعلیمات اقبال نے عقلی رجعت پسندی کی وہ رسم ڈالی جو منطقی اقدار کے لئے ایک ضرب کاری بن کر رہ گئی اور انہیں اتنا یارا نہ رہا کہ بے وقار اور پسماندہ زندگی جہنم کی نشانی ہے۔ آج ہی نہیں۔ ہمیشہ ہی دنیا میں صرف وہی قومیں کامران رہی ہیں جو حصول علم میں پیش پیش رہی ہیں۔ یہودی اس کی زندہ مثال ہیں۔ عربوں کی عالمگیر برتری کا راز بھی فنون علم و فلسفہ میں دسترس ہی تھی۔ آج ہم مغرب کے تلوے بھی اسی وجہ سے چاٹتے ہیں۔ یہ دنیا عاشقوں کی نہیں بلکہ دانشوروں کی دلدادہ ہے۔

اقبال نے الٹی گنگا بہا کر ہندی مسلمانوں کا ستیاناس کر دیا۔ پہلے وہ ایک قوم تھے تقسیم ہند کے بعد مسلمان تین حریف قومیتوں میں بٹ گئے اور جب تک کلام اقبال موثر رہے گا۔ برصغیر ہند کے مسلمانوں کا ستارہ حلقہ نحوست سے نہیں نکل سکے گا۔

اقبال کی سب سے بڑی ستم ظریفی یہ ہے کہ اس نے دلفریب پیغام عقل کشی سے تصور وطنیت کی تضحیک کی اور مذہب کو قومیت کی اساس ٹھہراتے ہوئے شاہ ولی اللہ دہلوی کی تقلید میں ہندوستان کو دارالحرب قرار دے دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ وطن سے محبت اور اس کا استحکام و خوشحالی نہ صرف قوم بلکہ افراد کی سلامتی۔ ترقی اور معاشی و فکری رفعت کی ضامن ہوتی ہے۔ جو شخص اپنے دیس کو ہی دارالحرب یعنی مذہبی تقدس کے نام پر قتل و غارت۔ بد دیانتی اور قومی غداری کا مرکز مان لے اس سے بڑا بد قسمت اور جاہل اور کون ہو سکتا ہے۔ اہل پاکستان جو صوبائی منافرت کی آگ میں جل رہے ہیں یہ نکتہ سمجھ چکے ہیں کہ قومیں مذہب سے نہیں وطن سے بنتی ہیں اور وطن شکن قومیں کبھی سلامتی اور چین کی دولت سے ہمکنار نہیں ہو سکتیں۔

سب سے بڑا گھر وطن ہے۔ جو لوگ اپنے گھر کو مسمار کرنے پر تلے ہوں۔ انہیں گھر کا سکھ کیسے مل سکتا ہے۔ یہ وہ نکتہ ہے جو صرف عقل مند لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں لیکن جو عقل کے دشمن بن چکے ہوں انہیں دانش و استدلال سے چڑ پیدا ہو جاتی ہے۔ انہیں ظلمت۔ ضیا اور ضیا۔ ظلمت دکھائی دینے لگتی ہے۔ اتنا ہی نہیں وہ کجروی کے اتنے عادی بن جاتے ہیں کہ غلط کو صحیح اور صحیح کو غلط ثابت کرنا ہی اصول دانش تصور کرنے لگتے ہیں۔ ایسی ذہنیت اللہ تعالےٰ کے خلاف بغاوت اور اس کی تحقیر ہے۔ آخر عقل کل تو وہی ہے۔ اس کا سب سے بڑا کرم بھی یہی ہے کہ اس نے انسان کو اپنے جوہر دانش سے جزوی طور پر نوازا۔

کلام اقبال ایسی ہی خدا آزار ذہنیت کا مبلغ ہے جس نے برصغیر ہند کے مسلمانوں کی آنکھوں پر عشق کی پٹی باندھ کر انہیں بصری دولت سے محروم کر دیا ہے۔ وہ اپنی عقیدت مندانہ گمراہی کو عشق قرار دیتے ہوئے بحر جذبات کی تباہ کن لہروں میں بہتے چلے جا رہے ہیں اور ان کی کشتی حیات کو عقل کا چپو نصیب نہیں جو انہیں ساحل مراد تک پہنچا سکے۔ یہ سب کلام اقبال

اقبال کی دین ہے جس کی جذباتی اور عقل کش اپیل نے لوگوں کی قسمت حضرت ابلیس کے حوالے کر دی ہے۔ جو مذہب کے نام پر ان سے جو چاہے کرانے کا مجاز بن چکا ہے

میں اقبال کی شاعرانہ عظمت کا قائل ہوں لیکن مجھے ان کے افکار میں کوئی فلسفیانہ گہرائی نظر نہیں آتی۔ فلسفی ہونا تو درکنار رہا وہ متکلم کی سطح پر بھی پورے نہیں اترتے۔ متکلمین۔ قوت عقل سے مذہب کو سائنس اور دیگر فنون کا ہمنوا بناتے ہیں لیکن اقبال نے تو عقل کی بڑی بیدردی سے تردید کر دی اور جذباتیت کو عشق کا نام دیتے ہوئے مسلمانوں کی زمام حیات اس راہزن کے حوالے کر دی اور اسے راہنما کا خطاب بخش دیا۔

آج برصغیر ہند کے مسلمان اقبال کے جوش انا کی حذتوں کا شکار ہو چکے ہیں۔ کیا تعجب ہے کہ جب تک اہل وطن کو مذہبی زبان میں مخاطب نہ کیا جائے کوئی بات ان کی سمجھ میں آتی ہی نہیں۔ افہام و تفہیم کا تعلق عقل و استدلال سے ہے۔ جن کی دانش۔ آتش عشق میں جل چکی ہو ان سے تہذیب کی دیوی روٹھ جاتی ہے اور تنزل انہیں تقدیر بن کر دبوچ لیتا ہے۔

اقبال شاعر اسلام نہیں۔ رجعت اور پسماندگی کے پیغامبر ہیں۔ ان کی انا پرستی۔ برصغیر ہند کے مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے لئے موت کا ایک موثر اعلان ہے۔ اس کے باوجود ان کا کلام عقیدت مندوں کے لئے نشہ بن کر رہ گیا ہے۔ آخر مریضوں کا مسکرات کے بغیر جینا ایک کٹھن مرحلہ ہی تو ہے۔

جوش انا! تیرا برا ہو جو اپنی تکمیل کا سنگ بنیاد۔ دوسروں کی رگ حیات پر رکھتا ہے۔

☆☆☆

Published by

Principality Publishers,
P.O. Box 918,
Cardiff.
CF 5 2NL.
U.K.